APRIL
2025

جدید نثر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

عید مبارک

شورش کاشمیری
موت سے واپسی

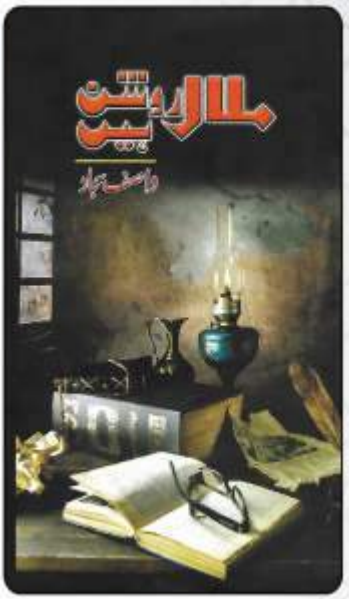

شہرِ جنونِ عشق
ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی

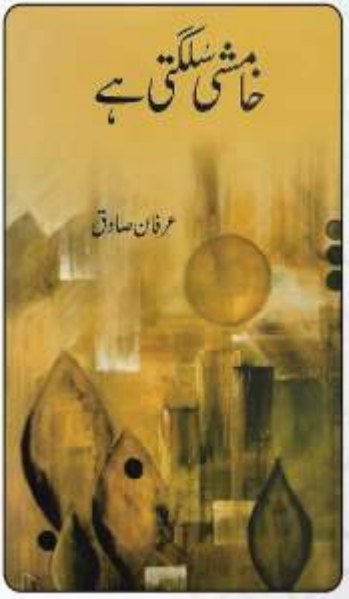

خامشی سلگتی ہے
عرفان صادق

غزل

روپ کو دھن جانا تو من میں لوبھ گھنیرا پھیل گیا
دریا دریا، صحرا صحرا، دامن میرا پھیل گیا

اے تاروں کے بکھراوے! اے نور بھری بے ترتیبی
کس کا ہاتھ پکڑ لوں جا کر دن بہتیرا پھیل گیا

شام کے طاق میں بولتی چڑیا، کنج چراغ میں لرزاں لو
کس کے عزم کی تکبیریں ہیں، کیسا سویرا پھیل گیا

حرفِ فتح کا سطرِ شکست میں نکتہ نکتہ پڑاؤ رہا
فتح مبیں تک حرفِ مبیں کا رین بسیرا پھیل گیا

آدھا گھر اک سورج گھر تھا، آدھ گھرا اک کاجل گھر
بھادوں کے بادل کا سایہ بن کے اندھیرا پھیل گیا

تیز ہوا کے پیچھے پیچھے مہکاروں کے لشکر تھے
خون دو پھول تھا جس کو جہاں بھی جس نے بکھیرا پھیل گیا

بوندوں کا بستر تھیں پلکیں، آنکھوں آنکھوں جل تھل تھا
میری باتوں سے سانسوں تک ساون تیرا پھیل گیا

گھر سے درد کمانے نکلے، دن کے ساتھ طلوع ہوئے
شام تری تیزی سے اتری اور اندھیرا پھیل گیا

پل کے پل وہ رات آئی جس رات کی بات بھی یاد نہیں
سانجھ تری چھب کے ڈھب گزری اور سویرا پھیل گیا

دم لینے کو جہاں ٹھہرے تھے، وہ منزل کیا منزل تھی
آدم خور درختوں کی باہوں کا گھیرا پھیل گیا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 37083901-9
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5252311 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - اپریل 2025 - شمارہ نمبر: 4

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: بیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد عارف ہسپتال سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	طارق بٹ، سرور حسین نقشبندی	7 تا 8
2	نعت	سید ریاض حسین زیدی، طالب انصاری، نیلما ناہید درانی سرور حسین نقشبندی، اکرم ناصر، فیض رسول فیضان	9 تا 14
3	عقیدت	آصف ثاقب، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، محمد افضال انجم صغیر احمد صغیر، نوید عاجز، مرزا آصف رسول	15 تا 22
4	رباعیات	گلزار بخاری، محمد نصیر زندہ، مرزا سکندر بیگ	23 تا 25
5	ہائیکو / ماہیے	خاور اعجاز، نسیم سحر، سیما پیروز	26 تا 28
6	سفرنامہ دنیا میرے آگے	اقبال خان یوسف زئی	29 تا 38
7	مضامین	جلیل عالی، حنیف باوا، رحمان حفیظ، شجاعت علی راہی طالب انصاری، افتخار الحق، عرفان صادق، فیصل زمان چشتی سید طاہر شیرازی، عرفان خانی، شبیر احمد آکاش فاطمہ ردا غوری، محمد ازرم، غیور حسین	39 تا 84
8	پنجاب کے گمشدہ کردار: بہروپیا	اعجاز رضوی	85 تا 89
9	طنز و مزاح / خاکے	خالد جاوید، اعجاز رضوی	90 تا 95

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، نسیم سحر گلزار بخاری، خاور اعجاز، شریف ساجد، ، نثار ترابی طارق بٹ، راحت سرحدی، شاہین عباس، جمشید چشتی افتخار شاہد، مسعود احمد، محمد انیس انصاری، منظور ثاقب اقبال سروبہ، انصر حسن، ذکی طارق، اکرم ناصر، عزیز فیصل رانا سعید دوشی، درخشندہ نوید، احمد جلیل، محمد نوید مرزا، آصف شفیع عرفان صادق، آفتاب خان، اعجاز دانش، افتخار الحق، ثمینہ سیّد اصغر علی بلوچ، نائلہ راٹھور، ہمایوں پرویز شاہد، ظہور چوہان افروز رضوی، رضا اللہ حیدر، راجہ عبدالقیوم، خالدہ انور صغیر احمد صغیر، فیض رسول فیضان، محمد اشرف کمال، اکمل حنیف شوکت محمود شوکت، نبیل احمد نبیل، ارشد محمود ارشد، عابد رضا میتھیو محسن، محمد یوسف، بشیر احمد حبیب، محمد اشفاق بیگ نعمان محمود، غضنفر مہدی، اکرم جاذب، سرور فرحان، عاصم بخاری کوکی گل، اسد رضا سحر، مہر علی، مستحسن جامی، ندیم ملک دلشاد احمد، عقیل عباس، علی تاصف، حسین ثاقب، عبدالرؤف زین نعمان فلک، ثمر جمال، خالق آرزو، سرفراز عارض محمد علی ادیب، حیدر بخاری، نوید صادق، اعجاز رضوی	96 تا 169
11	افسانے	اسلام عظمی، سیما پیروز، کلیم خارجی، وسیم جبران، آستھ کنول بابر اثنین ابر، طوبیٰ صدیقی، محمد اویس	170 تا 218
12	مائکرو فکشن	شہزاد نیر، بشریٰ شیریں، ابنِ حسین شعیب الرحمٰن، عاصم بخاری	219 تا 222
13	نظمیں	جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، منظر اعجاز احمد جلیل، نائلہ راٹھور، علمدار حسین، امجد بابر، شوکت محمود شوکت زعیم رشید، سید طاہر شیرازی، محمد یوسف، مہر علی دلشاد احمد، شبیر احمد آکاش، شائستہ رمضان، اعجاز رضوی	223 تا 241

حمد

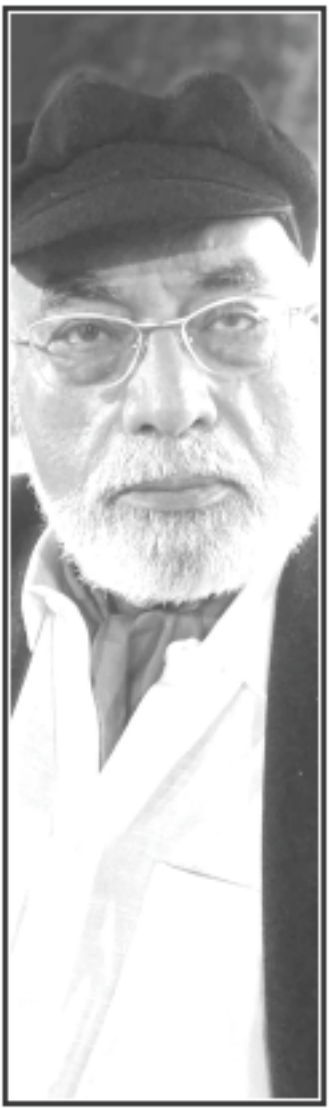

ہوئی ہے نقش گر، آنکھوں کو، روشنی کیوں کر
ہیں دل دماغ ، عبارت خیال کی کیوں کر

یہ کون سُر ہیں جو بُنتے ہیں دھڑکنیں دل کی
قرار پاتی ہے کانوں میں نغمگی کیوں کر

ہے کیا نیاز جبینوں کو سجدہ گاہوں سے
یہ مُہر ہوتی ہے محرابِ بندگی ، کیوں کر

چراغ ہوتی ہے آنکھوں میں کیسے بے خوابی
شجر جگائے ، اذانِ سحر گہی کیوں کر

خزاں نصیب جو ، ہر ایک زندگی کی رو
پہ ایک شاخِ الم ہے ہری بھری کیوں کر

ہو تلخ تاب ، کسی لمحے ، چاشنی کا سواد
کبھی ہے زہر پیالے میں زندگی کیوں کر

فضا میں کون جگاتا ہے موسموں کی ترنگ
یہ انگ انگ چٹختی ہے تازگی کیوں کر

ہیں میرے رب کی سجائی یہ رونقیں ساری
نظر نظر نہ ہو آخر کو ، حیرتی کیوں کر

جو تار و پود نہ ہوں میرے، حمد میں اُس کی
تو بالباس ہو ، میری یہ بندگی کیوں کر

طارق بٹ

حمد

لب پر مرے جو ذکر و ثنا ہے خدائے پاک
تیرا کرم ہے تیری عطا ہے خدائے پاک

دونوں جہاں میں تیرا نہیں ہے کوئی شریک
خلقت کا ایک تو ہی خدا ہے خدائے پاک

ہر سو تری ہی نور کے جلوے ہیں عکس ریز
ہر سمت تو ہی جلوہ نما ہے خدائے پاک

سب انبیا رسل تری وحدت کے ہیں نقیب
سجدہ فقط تجھی کو روا ہے خدائے پاک

اس نے تجھے یقیں سے پکارا ہے بالیقیں
نخل مراد جس کا ہرا ہے خدائے پاک

تو ہی ہر ایک رنج و الم میں ہے دستگیر
تیری ہی یاد غم کی دوا ہے خدائے پاک

تیرے کرم سے میرا بھرم ہے جہان میں
ورنہ مری بساط ہی کیا ہے خدائے پاک

کھولے ہیں اس کی فکر پہ حمد و ثنا کے باب
سرور پہ تیری کتنی عطا ہے خدائے پاک

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

دن منور ہیں چاندنی راتیں
آپؐ ہی کی ہیں یہ مداراتیں

سب اجالوں سے ہو گئے روشن
نور افزا ہیں آپؐ کی باتیں

روشنی آگئی زمانے میں
دل میں اُتریں حضورؐ کی نعتیں

سب سے محکم ہے آپؐ سے نسبت
اور کچھ کام کی نہیں ذاتیں

انؐ کے کسبِ کمال کی فہرست
سب حدیثوں کی خوب تر باتیں

میں ریاضِ نبیؐ کا باسی ہوں
مجھ پہ خوشبو کی ہیں مداراتیں

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سرخ ہوئے، پھر نورِ نمو سے، پھولوں کے رخسار
عکسِ جمالِ یار سے ٹھہرا، ہر چہرہ گلنار

نعتؐ

جب بھی دکھائی دے گئے آثار نعت کے
تخلیق کیا سے کیا ہوئے شہکار نعت کے

تعمیرِ قصرِ دل کرو اس اہتمام سے
چھت ہو درود کی ، در و دیوار نعت کے

باغِ زبانِ شعر و ادب کی ہیں رونقیں
سایا بکھیرتے ہوئے اشجار نعت کے

دل کی منڈیر پر انہیں رکھا ہے مستقل
مجھ کو ملے چراغ جو دو چار نعت کے

لایا ہوں سامنے میں عقیدت کے زور پر
ہر لفظ میں چھپے ہوئے اَسرار نعت کے

مجھ کو بلا نہ گنبدِ اصنافِ دیگراں
اب میرے چار سمت ہیں مینار نعت کے

دنیا فدائے دولتِ دنیائے بے ثبات
میرا اثاثہ ان گنت اشعار نعت کے

روشن ہوا ہے دل تو فروزاں نظر ہوئی
یوں جسم و جاں میں گھُل گئے انوار نعت کے

طالب انصاری

نعتؐ

اپنے محبوب کو جب رب نے پکارا ہوگا
عرش کو مل کے فرشتوں نے سنوارا ہوگا

آمنہ دیکھ کے مکھڑا یہی کہتی ہونگی
رب نے اس چاند کو جنت سے اتارا ہوگا

عرش کی آخری منزل پہ جو پہنچے ہوں گے
مرے آقا نے بھی لبیک پکارا ہوگا

ان کے آنے کی خبر عرش پہ پھیلی ہوگی
سارے نبیوں نے بھی پھر عرش سنوارا ہوگا

وہ جو رحمت ہیں جہانوں کے لیے آئے ہیں
مرحبا ، مرحبا ہر ذرہ پکارا ہوگا

روز محشر وہ شفاعت کے لیے آئیں گے
ہر گنہگار کو ان کا ہی سہارا ہوگا

نیلما ناہید درانی

نعتؐ

جو مدحت حضور سے وابستہ ہو گئے
باران رنگ و نور سے وابستہ ہو گئے

پایا جنھوں نے درگہِ اُمی لقب سے فیض
وہ دولتِ شعور سے وابستہ ہو گئے

ان کو نہیں ہے خوف قیامت کی دھوپ کا
جو دامنِ حضور سے وابستہ ہو گئے

عشق رسول ماورا سب فاصلوں سے ہے
دیکھو اویس دور سے وابستہ ہو گئے

ہم بھی چراغ طاق حرم سے لگا کے لو
وابستگانِ نور سے وابستہ ہو گئے

رحمت نے میرے سارے گھرانے کو چُن لیا
سب مدحتِ حضور سے وابستہ ہو گئے

دیکھا حرم میں صبح کا منظر تو یوں لگا
ہم ساعت ظہور سے وابستہ ہو گئے

ذکر رسول سے ہوئی وہ کیفیت نصیب
سرور عجب سُرور سے وابستہ ہو گئے

سرور حسین نقشبندی

نعت

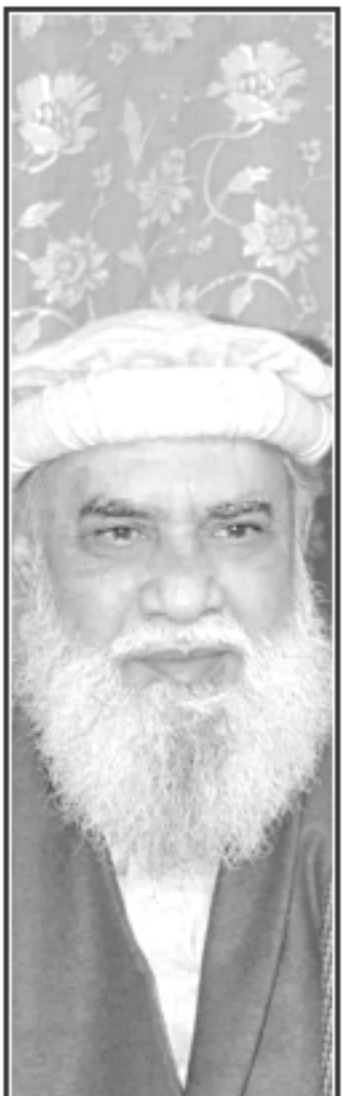

اڈ آئے پرندے خواہشوں کے جب دعا بن کر
لپٹ جاؤں گا ان کے در سے حرفِ التجا بن کر

گئے عرشِ بریں پر جو امام الانبیا بن کر
رہے عرشِ بریں پر وہ حبیبِ کبریا بن کر

یقیں مانو رعایا میں جو رہتے تھے خدا بن کر
مدینہ کے گلی کوچوں میں پھرتے ہیں گدا بن کر

گئے تھے تو محمد ابن عبداللہ تھے لیکن
حرا سے لوٹ کر آئے محمد مصطفٰے بن کر

خدا کا شکر وہ مجھ کو بھی اس بستی میں لے آیا
تری رحمت برستی ہے جہاں ہر سو گھٹا بن کر

وہ ظالم اور فاسق کے لئے تیغِ برہنہ تھے
جو آئے بے نواؤں کی زمانے میں نوا بن کر

کبھی کنکر گواہی دیں گواہی دے کبھی اکرم
عصا سے اژدھا اور اژدھا سے پھر عصا بن کر

اکرم ناصر

نعتؐ

ایسی لگن سے ذکرِ مدینہ کرے کوئی
گھر بیٹھے دیدِ گنبدِ خضریٰ کرے کوئی

پھر ہر مرض کا شوق سے چارہ کرے کوئی
پہلے درود ، ورد وظیفہ کرے کوئی

دشوار تو نہیں ہے نکیرین کا جواب
خیر الورا کا پیش حوالہ کرے کوئی

لے جائے اپنے ساتھ محبت حضور کی
یوں ظلمتِ لحد میں اُجالا کرے کوئی

بادِ سحر کے ہاتھ فغانِ سحر گہی
دربار مصطفیٰ کو روانہ کرے کوئی

جزو دُعا بنا کے درود و سلام کو
بگڑے معاملات سنوارا کرے کوئی

قرب و رضائے ذاتِ الٰہی کے واسطے
نام نبی پہ جان کو وارا کرے کوئی

عشقِ رسول کے ہیں تقاضے بڑے کٹھن
پہلے عمل ہو بعد میں دعویٰ کرے کوئی

رہبر بنا کے اُسوۂ خیرالانام کو
منزل کا اپنے دل میں نظارہ کرے کوئی

سرکار ہر غلام کی سنتے ہیں زاریاں
جب بھی جہاں بھی اُن کو پکارا کرے کوئی

فیضان! رنگ، شانِ کریمی دکھائے گی
جذبے میں کچھ خلوص تو پیدا کرے کوئی

فیض رسول فیضان

عقیدت

میری آنکھوں میں منوّر خانہ کعبہ
اور اشکوں کا ہے محور خانہ کعبہ

اس کے ارماں ہی مرے دل میں بسے ہیں
یاد رکھتے ہیں وہ اکثر خانہ کعبہ

اس سے ایماں کی خبر سب کے لیے ہے
اس کو جانو ہے مبشر خانہ کعبہ

دیکھنے کی یہ تمنا جو مری ہے
مجھ سا پائے گا قلندر خانہ کعبہ

خانہ کعبہ ہے سہارا ، میرا ثاقب
ہر قدم پر ہے مظفر خانہ کعبہ

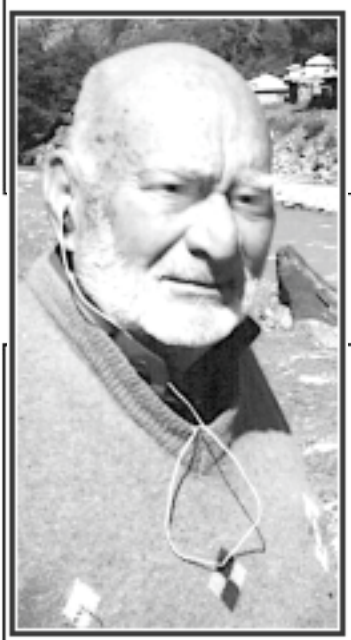

آصف ثاقب

مدینے کا ہے جلوہ سبز گنبد
مری آنکھوں کا سبزہ سبز گنبد

اٹھی ہیں اس کی جانب سب کی نظریں
جہانوں کا اجالا سبز گنبد

اسی سے سب کا ہے ایماں مکمّل
یہ جنت کا اشارہ سبز گنبد

سبھی اچھّوں سے اچھا سبز گنبد
نہایت شان والا سبز گنبد

اسی سے آئے گا مجھ کو بلاوا
امیدوں کا سہارا سبز گنبد

مجھے ثاقب تسلّی ہو رہی ہے
جو خوابوں میں ہے دیکھا سبز گنبد

عقیدت

غم کی خوشبو سے معطر ہے کتابِ کربلا
ہر ورق ہے سرخ از خونِ گلابِ کربلا

فجر کا لمحہ طلوعِ مہرِ دُنیا کے لیے
عصر کی ساعت برائے آفتابِ کربلا

حرفِ آخر میں لکھا جائے گا صرف اسمِ حسینؓ
نامِ اسمٰعیلؑ ہو گا انتسابِ کربلا

کیا ہمارے دَور میں بھی آئے گا کوئی حسینؓ
یہ جو کُھلتا جا رہا ہے ہم پہ بابِ کربلا

ہم نے پوچھا کیا یہی ہوتا ہے مہماں سے سلوک
کچھ نہیں بس اِک خموشی تھی جوابِ کربلا

وقت کے دربار میں ہوتے ہیں سارے فیصلے
کربلا ہی میں نہیں ہوتا حسابِ کربلا

ہم نہیں گھبرانے والے امتحانوں سے کبھی
ہم کو ازبر ہے ، غنیمِ جاں ! نصابِ کربلا

خاور اعجاز

عقیدت

شبِ سیہ میں تبسم کیا حضورؐ نے ، گر
تو رنگ و نور سے یک دم فروزاں ہو گیا گھر

حضورؐ آئے تو مکّہ کی ساری ماؤں میں
خدا نے جشنِ ولادت منایا، بانٹے پسر

کسی کا نام نہ تھا کائنات میں ''احمدؐ''
نہ اور کوئی ''محمدؐ'' ہوا تھا دھرتی پر

تمھارا نام بھی نقطوں سے ماورا رکھا
تمھیں بھی عیب سے اللہ نے رکھا بالاتر

پکارے جائیں گے آدمؑ ''ابو محمدؐ'' سے
یہ کنیت نہ کسی کو ملی سرِ محشر

فرشتے آپؐ کو جھولا جھلایا کرتے تھے
حلیمہ سعدیہؓ نے دیکھا ہو گا یہ منظر

اِسی لیے اُنھیں سائے سے پاک رکھا تھا
کسی کا پاؤں نہ آ جائے اُن کے سائے پر

یہ کیسا لحنِ تلاوت تھا آقاؐ ، کافر بھی
سیاہ راتوں میں سُنتے تھے جس کو چھپ چھپ کر

تمھارے ہاتھ سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑے
حدیبیہ میں اگر تشنہ لب رہا لشکر

بنا دیا گیا ساری زمیں کو سجدہ گہہ
تمھارے واسطے پاکیزہ، صاف اور اطہر

اُنھی کے ہاتھ میں ہو گا لوائے حمد انیس
اکٹھے ہوں گے وہیں سب نبی سرِ محشر

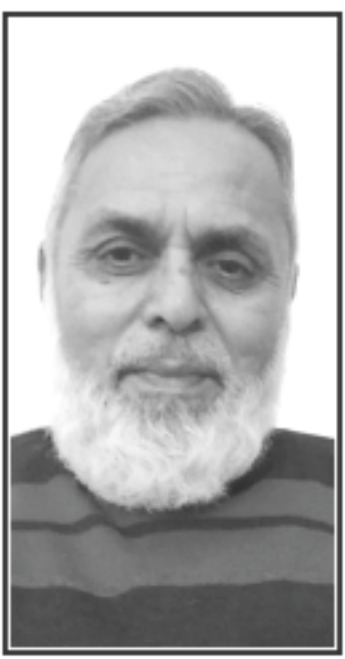

محمد انیس انصاری

عقیدت

ہمیں بھی لے کے گیا جب خدا مدینے میں
ملی ہر ایک مرض کی دوا مدینے میں

حیات میں ہمیں ہر ایک سے شکایت تھی
رہا نہ کوئی بھی شکوہ گلہ مدینے میں

ادب کا رنگ ہی غالب تھا چاروں اور اپنے
لبوں سے نکلی نہ اونچی صدا مدینے میں

لپٹتے دیکھا گلے سے نبیؐ کی رحمت کو
برستے دیکھی کرم کی گھٹا مدینے میں

کسی بھی شب میں اندھیرے نظر نہیں آئے
بکھر رہی تھی ہر اک سو ضیا مدینے میں

نبیؐ کے روضے کو چھو کر گزرتے دیکھی ہے
ہماری آنکھوں نے، بادِ صبا مدینے میں

جمی ہوئی تھی ہر اک شے خود اپنے مرکز پر
ہر ایک چیز تھی بالکل بجا مدینے میں

اُترتے دیکھی ہے دل میں عجیب سی ٹھنڈک
ہوا ہے دل کا بھی موسم ہرا مدینے میں

میں جوں ہی پہنچا مواجہہ کے سامنے انجم
بدل کے رہ گئی دل کی فضا مدینے میں

محمد افضال انجم

عقیدت

محبت کا سکھا دیجے سلیقہ یا رسول اللہ
مرے دل میں ہو مدحت کا اجالا یا رسول اللہ

ابھی عشاق سی میری نہ صورت ہے نہ سیرت ہے
غلامی کا کروں کیسے میں دعویٰ یا رسول اللہ

مری ہر سانس ہی وقفِ درودِ پاک ہو جائے
ثنا خوانی بنے میرا حوالہ یا رسول اللہ

ہے مدت سے کسک دل میں مجھے در پر بلا لیجے
مرے غم کا بھی ہو جائے مداوا یا رسول اللہ

میں کاش ان کے زمانے میں اگر پیدا ہوا ہوتا
بلانے پر میں کہتا: جی میں آیا یا رسول اللہ

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ڈھونڈتی ہیں کب سے جیون کے سپنوں کی تعبیر
میری خالی آنکھیں میرے خوابوں کے نخچیر

عقیدت

فتحِ مبین کے کہاں آنے کی دیر تھی
اُن کے دعا کو ہاتھ اٹھانے کی دیر تھی

فارس کی آگ بجھ گئی ، ایواں لرز اٹھا
بزمِ جہاں میں آپ کے آنے کی دیر تھی

دشمن تھے جان کے جو، بنے ان کے جاں نثار
بیڑا محبتوں کا اٹھانے کی دیر تھی

رضوان خلد سے مجھے لینے کو آ گیا
نقشِ قدم پہ آپ کے جانے کی دیر تھی

جلوے دیارِ نعت کے دل میں اُتر گئے
یادِ نبی کا دیپ جلانے کی دیر تھی

منکر نکیر دے کے سلامی چلے گئے
عاجز بس ان کو نعت سنانے کی دیر تھی

نوید عاجز

عقیدت

مخفی نہیں حضور سے تو اے صدائے دل!
وہ جانتے ہیں وہ بھی جو ہے ماورائے دل

کھلتی ہے جس پہ چلنے سے اندر کی کائنات
ہے ان کے نقشِ پا میں وہ راہِ رسائے دل

جچتا نہیں ہے اس کی نظر میں جہانِ زر
حاضر ہے شاہ قدس کے در پہ گدائے دل

صلّو علیہ سوچیے چاہے وسلّموا
تسلیمِ جاں ہے حاصلِ عہدِ ولائے دل

ہیں بامراد صلِّ علیٰ کے چمن میں سب
وہ ''ہائے گل'' کی آہ وفغاں ہے کہ ''ہائے دل''

چشمِ خرد ہے خیرہ فسونِ فرنگ سے
سنت کی روشنی اُسے کیسے دکھائے دل؟

گفتار بھی مہکتا ہے کردار بھی کہ جب
یادِ رسولؐ سے ہو معطر فضائے دل

دل ربِ مصطفیٰؐ کی امانت ہے، اے بشر!
ہے اس دیار میں تری جاں بھی برائے دل

خیر الامورِ اوسطُھا نفیِ انتہا
ہے خیرِ عشق یہ ہو کوئی انتہائے دل

دیں جسم و جان وعلم وعمل کا ہے تزکیہ
اور عشقِ مصطفیٰؐ ہے اساسِ صفائے دل

دیں کے وجود کے لیے اے طاعتِ رسولؐ!
''تو آرزوے جان ہے، تو مدعائے دل''

فیضِ آگہی کا نورِ محمدؐ سے پا کے وہ
عارف ہے رب کا بھی جو ہوا آشنائے دل

ہے وقت ممکنات کا اک بحرِ بے کراں
دل زندگی کی ناؤ ہے، وہ نا خدائے دل

انساں کئی حسیں ہیں مگر احسن البشر
اُن سا ہے کون؟ دیکھے بنا جس پہ آئے دل

قرآنِ زیست ہیں کہ وہ عنوانِ کُن فکاں
ہے ابتدا بھی اُن سے، وہی منتہائے دل

کُھلتا ہے عشق مصطفویؐ سے ضمیر پر
کیا ہے روائے دل یہاں؟ کیا ناسزائے دل؟

کرنا ہے پیش جب اِسے اُن کے حضور میں
اے عشق! آنسوؤں میں تو پھر کیوں بہائے دل

ناموسِ مصطفیٰؐ پہ جو قرباں ہیں اُن سے پوچھ
دل ہے اساسِ جان؟ کہ جاں ہے بنائے دل؟

وہ کاروانِ طیبہ رُکے گا نہیں کہیں
آمادہ جس کو ہر گھڑی رکھے درائے دل

بونا پڑے گا صلِ علی کا چمن اِسے
گر چاہتا ہے راحت و رحمت کے سائے دل

اُن کی رضا حدائقِ بخشش کا ہے ثمر
اُن کی رضا کے چاہیے تابع رضائے دل

جاں میں بسا لو ذکرِ محمدؐ تو پھر کبھی
ہو گی نہ بے چراغ یہ مہماں سرائے دل

عشقِ رسول کی مئے پندار کے سبو
لازم ہے اپنے آپ کو پہلے پلائے دل

عشقِ رسول سے ہے ضمیروں کا انقلاب
جب حیلہ گر خرد کی بھی بدلے گا رائے دل

میلاد مصطفیٰ ہے ''زرِ نورِ حق'' تو پھر
سو جاں سے کیوں نہ عیدِ سعادت منائے دل؟

جب سے ہے ''یُمنِ آمدِ نورِ حرا'' کی یاد
روشن حرائے جاں ہے، منور حرائے دل

وہ عہدِ عشق عہدِ ''رسولِ قدیر'' ہے
کرنی ہے جس پہ جاں بھی فدا، اے وفائے دل

اے تشنگی! جو ساقیِ کوثر کا رند ہے
کیوں اور مئے کدوں پہ؟ اُسے لے کے جائے دل

آصف! بہ حرف صلِ وسلم علی النبی
خیرالکلام ہے مرا طرزِ نوائے دل

مرزا آصف رسول

رباعیات

اللہ کے ہی اسم سے آغاز کریں
اکرام و عنایات کا در باز کریں
وہ ذات ازل سے ہے جو رحمان و کریم
اس کے ہی کرم سے سخن اعجاز کریں

.....

حق حمد سرائی کا ادا کیسے ہو
عاجز کو یہ توفیق عطا کیسے ہو
ہم وصف محمدؐ کے نہیں گن سکتے
محمود کی توصیف و ثنا کیسے ہو

.....

ٹھہرے ہیں ولی قبلۂ ارباب سخن
کہتا ہے وہی محرم آداب سخن
در تازہ مضامیں کا نہیں بند کبھی
تا روز قیامت ہے کھلا باب سخن

.....

کہہ دو دل و جان سے کہ ہے اللہ احد
ہرگز نہیں محتاج کسی کا وہ صمد
آ دیکھیں ذرا اس کی احدیت کا ثبوت
والد ہے کسی کا نہ ولد ہے اللہ

اخلاص کسے بزم جہاں سے ملتا
پیغام شرف کس کی زباں سے ملتا
اے فاطمہ ہوتی نہ اگر آل تری
مفہوم شرافت کو کہاں سے ملتا

.....

ترکیب نمائش ہے غضب یاروں کی
گم ہو گئی بینائی خریداروں کی
ہر چند وہ تاجر ہیں خذف ریزوں کے
قیمت انھیں ملتی ہے گہر پاروں کی

.....

اعلان سہی تاب و تواں ہونے کا
منزل کی طرف تیرے رواں ہونے کا
تجھ پر ہے یہی فرض کرے کسبِ کمال
نسخہ ہے یہ مقبولِ جہاں ہونے کا

گلزار بخاری

رباعیات

دستار سے اوجِ عرفاں کیوں نہ ہوا
سر عیب و ہنر کا عریاں کیوں نہ ہوا
واعظ کی نادانی پہ رحم آتا ہے
مسلم تو ہوا پر انساں کیوں نہ ہوا

.....

آوارہ خیال خواب داں میں اتر آئے
نظارے پھسل کے سائباں میں اتر آئے
وہ یاد کے رخسار پہ بوسے کا پھول
خوشبو کے سبھی رنگ گماں میں اتر آئے

.....

قلزم کا سفیر آبلہ پا نکلا
دریا بھی آرزو کا پیاسا نکلا
آئینۂ رنگ میں در آئی تصویر
افسانہ حقیقت کا تماشا نکلا

.....

اندیشۂ تعبیر سے ڈر جاتے ہیں
معنی کی سواری سے اتر جاتے ہیں
ہائکو نہ شتر وار غزل کے ریوڑ
الفاظ میاں خودکشی کر جاتے ہیں

.....

دیوار میں در آئے نہ بیاباں کا رنگ
لا آنکھ بھر آغوشِ گلستاں کا رنگ
کوئی بوسہ صبا کی مٹھی میں رکھ
شاید کہ چرا لائے لب جاں کا رنگ

.....

لذت کا درد بیزباں ہوتا ہے
ڈھولک کی تھاپ پر بیاں ہوتا ہے
آئینۂ تمثال میں جلتا ہے چراغ
ہر نقش خیال کا دھواں ہوتا ہے

.....

جام و ساغر کے بلبلے پھوٹ پڑے
دریا ساحل کے ہاتھ سے چھوٹ پڑے
آئینہ درمیان سے ہٹ گیا تو
دو سائے اک دوسرے پر ٹوٹ پڑے

محمد نصیر زندہ

رباعیات

کیسے کیسے سوال کر دیتے ہیں
کم سن بھی اب کمال کر دیتے ہیں
دروازے کھول کر نئی دنیا کے
سوچوں کو لازوال کر دیتے ہیں

.....

دردِ دل کی دکاں لیے پھرتے ہیں
اپنے من میں جہاں لیے پھرتے ہیں
ہم جیسے بے نشاں سکندر کتنے
آنکھوں میں آسماں لیے پھرتے ہیں

مرزا سکندر بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گنگ ہونٹوں کے سخن دیدۂ تر سے سُنیے
ایک چرچا ہے ، اگر گوشِ نظر سے سُنیے

ہائیکوز

خاور اعجاز

سورج اور جاپان
بالکل ایسے ہیں جیسے
ہم اور پاکستان

.....

اک سا فکر و فن
میرؔ و غالبؔ سے شاعر
باشوؔ اور بوسنؔ

.....

میرے گھر کی شان
دروازوں کی آنکھیں ہیں
دیواروں کے کان

.....

دل موسم بدلے
وہ بھی اگر میری ہی طرح
فون کی سم بدلے

.....

باہر دھول ہی دھول
آنگن میں لیکن مہکیں
چنبیلی کے پھول

ماہیے

اپنوں میں نہیں دیکھا جس دن سے وہ روٹھا ہے
تعبیر تو کیا ، اُس کو دل جڑ ہی نہیں پایا
سپنوں میں نہیں دیکھا کچھ ایسے یہ ٹوٹا ہے

.....

بھرپور جوانی ہے
جاناں کا سراپا بھی
دلچسپ کہانی ہے

.....

برہم ہوں زمانے سے
روکا ہے ہمیں اس نے
کیوں ملنے ملانے سے

.....

دل توڑ گیا کوئی
آتے ہوئے جب ، اپنا
رخ موڑ گیا کوئی

نسیمِ سحر

ماہیے

دریا کا کنارا ہے
یہ دردِ جدائی تو
بس اپنا سہارا ہے

....

آکاش پہ تارے ہیں
دھرتی پہ جو بکھرے ہیں
وہ اشک ہمارے ہیں

....

کوئی پتا چناروں کا
دے سندیس مجھ کو
تو آتی بہاروں کا

....

بادل کیوں برستے ہیں
تم دور نہیں پھر بھی
ملنے کو ترستے ہیں

....

جوگی اترا پہاڑوں سے
پتہ پوچھوں ساجن کا
کونجوں کی ڈاروں سے

تو دیا میں باتی ہوں
ساتھ نہ چھوڑوں گی
سوگندھ یہ کھاتی ہوں

....

ٹہنی سے گری کلیاں
کیوں چھوڑ چلے ساجن
تم پیار بھری گلیاں

سیما پیروز

دُنیا میرے آگے

یارو! بس حکمرانوں کا ملک دیکھنا چاہتا ہوں مگر وہ اجازت نہیں دیتے حکمران جو ٹھہرے اپنی تسلی کے لیے سابق کہہ لو تم تو سدا کے جھگڑالو ہو اور ضدی بھی صدا دیتے رہو مگر تمھارا جھگڑالو کہنا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بھئی تم اپنے آپ سے بھی تو جھگڑا کرتے ہو___ کیا نہیں کرتے؟

ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ چلو مان لیا اب دوبارہ ویزا کے لیے کوشش کر لیتا ہوں۔

میں نے فون بند کرتے ہوئے ندیم سے کہا۔ اور پھر ایک شام بیٹے نے بتایا کہ صبح آپ کو برطانیہ ویزا کے سلسلہ میں بلایا گیا ہے۔ اُمید و بیم کی کیفیت لیے میں وقتِ مقررہ پر پہنچا۔ پاسپورٹ پر یُو کے کا ویزا دیکھ کر خوشی ہوئی سامانِ سفر تو پہلے ہی سے تیار تھا کہ اگر یُو کے کا ویزا نہ ملا تو امریکہ بیٹوں سے ملنے تو جانا ہی ہے۔ قطر ایئر لائن سے دوحہ باقی سفر برٹش ایئر ویز سے لندن کے لیے کرنا تھا۔

ایک بقراط وزیر نے اسمبلی کے فلور پر کہا تھا کہ پی آئی اے کے بیشتر پائلٹ لائسنس نہیں رکھتے شاید کھلبلی پیدا کرنے کے لیے۔ سو کھلبلی پیدا ہوئی اور بڑی ایئر لائنز امارات اور برٹش ایرویز نے پاکستان کا سفر موقوف کر دیا کہ مصنوعی طریقے سے ترتیب دی ہوئی قوم پاکستان میں بستی ہے سو باکمال لوگ لاجواب پرواز لکھنے والے اپنے ملک میں ہی مزید کمال پیدا کریں بیرون ملک پروازیں بھی محدود کر دی گئیں یہاں ویسے بھی پڑھ کوئی نہیں اگر کوئی ہے بھی تو وہ خامیاں تلاش کرنے والوں کی صفِ اوّل میں کھڑا ہے۔ زیادہ تر مکھی کی خاصیت والے کہ جو گندگی پر ہی بیٹھتی ہے۔

لندن کا ہیتھرو ایئر پورٹ اتنا بڑا ہے کہ ایک چھوٹے سے ٹاؤن کا شائبہ ہوتا ہے، جہاں ہر 40 سیکنڈ بعد ایک جہاز اُترتا ہے۔ ریڈنگ میں ایک رات مکمل آرام کے بعد میرا بھانجا سلمان لندن کی سیر کرانے نکلا دو ہفتے سیر سپاٹے میں گزر گئے۔

لندن جا کر احساس ہوتا ہے کہ کس قدر منظم قوم ہے اپنے اسلاف کے بنائے ہوئے اصولوں کی پابند 1096 کی تعمیر کردہ آکسفورڈ یونیورسٹی

اقبال خان یوسف زئی

دیکھ کر یہ احساس اور بھی پختہ ہو جاتا ہے اپنے اسلاف کی تعمیر کردہ عمارات کو اُنھوں نے جس خوبی سے جس سلیقہ سے اور جس ذمہ داری سے سنبھالا ہوا ہے یہ اسی قوم کا کام ہے دیواروں کے اوپر ایک سمیٹ کا سائبان سا بنا کر بارش کے پانی سے موسمی اثرات سے بچایا گیا ہے تا کہ دیوار اور اپنے عہد کی تعمیر دونوں محفوظ رہیں۔ اب وہ ونڈ سرکسل ہے بکنگھم پیلیس ہے۔ ریل کا زیرِ زمین انتظام ہے۔ برٹش میوزیم ہے۔ بی بی سی (کمرشل نہیں ہے) سینکڑوں برس پُرانی تاریخی عمارت ہیں وضع ڈیزائن میں محض سیمنٹ کی سپاٹ تعمیر نہیں صناکاری کا شاہکار نظر آتی ہیں۔ آدمی محض دیکھتا ہوا نہیں گزرتا ٹھہر کے دیکھتا ہے اُس کے حُسنِ تعمیر سے متاثر ہوتا ہوا دل ہی دل میں داد بھی دیتا ہے بیشتر عمارات کو دیکھ کر میرے دل سے ایک سوال اُبھرتا ہے اُن سے پوچھوں تمھارے بنانے والے ہاتھ تو اب سلامت نہیں مگر وہ کیا باکمال لوگ تھے جنھوں نے تمھیں بنایا تھا تعمیر کیا تھا۔ جنگِ عظیم کے دوران بگ بین کی آواز کیا جادوئی اثر رکھتی تھی مکینوں کو حوصلہ دیتی ہوئی دور تک اپنی وسعت میں پھیلی ہوئی۔ وقت کی آواز__ اُس وقت کے زندہ لوگ اُس کی آواز آج کی طرح سُنتے ہوں گے وہ لوگ تو سلامت نہیں مگر بگ بین اب بھی آج بھی اپنی آواز سے اپنے زندہ ہونے کی آواز سماعت تک پہنچا رہا ہے دریائے ٹیمز کی روانی کی طرح میں نے بگ بین کی تصویر کھینچی جب ایک ڈبل ڈیکر بس سڑک سے گزر رہی تھی۔ چلو دل سے کیا ہوا اِک وعدہ کہ حکمرانوں کا ملک بھی دیکھ لیا جائے پورا ہوا۔ دو ہفتے گویا دو خوبصورت ساعتوں کی طرح گزرے ہوائی سفر کے نیویارک کے ملوں میں پھیلے ہوئے گارڈینیا۔ جان ایف کینڈی ایئر پورٹ کے پہلو میں نیو آرک ایئر پورٹ پر اُترنے کے لیے نیوجرسی میں رہائش پزیر (نیو جرسی کو گارڈن سٹیٹ کہا جاتا ہے) دونوں بیٹوں نے پروگرام بنایا کہ مجسمۂ آزادی دیکھا جائے گا اس سے پہلے دُور سے دیکھا تھا اب قریب سے بھی نظارہ کیا جائے گا۔ کار پارکنگ سے فیری ٹکٹ کے لیے پیدل چلنا پڑا تو بیٹے کو خیال آیا کہ مجھے پیدل چلنے میں دقت ہو رہی ہے موبائل سے وہیل چیئر کے لیے آرڈر کیا جو دوسرے دِن مل گئی میں نے سوچا اتنی دُور تک چلنا مشکل ضرور ہے مگر دونوں بیٹوں اور اُن کے دونوں بچوں کے ساتھ اِتنا آسان کیوں بن گیا ہے کہ میں ایک ٹانگ کے گھٹنے کے کمزور ہونے پر بھی رواں دواں ہوں۔ فاصلہ ہے مگر محبت سے کہے لفظوں میں وہ قوت ہے جو مجھے چلنے کے لیے اُکساتی ہے اور میں اُن کے ساتھ چل رہا ہوں۔ فیری دریائے ہڈسن کے پانی کو چیرتی ہوئی جا رہی ہے میں اُوپر کی کھلی منزل سے قرب و جوار کا نیویارک کی فلم بوس عمارات کا یہ منظر دیکھ بھی رہا ہوں اور محفوظ بھی کر رہا ہوں اپنی یادداشت کے البم میں۔ چاروں اور پانی ہی پانی صاف بھی شفاف بھی فیری ڈیک Devk سے ایک گھومتی ہوئی سڑک ہے جہاں 1886 میں فرانس میں بھیجا ہوا مجسمہ

آزادی بلند جگہ پر ایستادہ آزادی کے قدردان فرانس کی قدر و منزلت بیان کرتا ہوا اس مجسمہ کی شکل میں امریکہ کا اپنے وطن کی آزادی کے لیے مر مٹنے والوں کی لافانی جدوجہد اور عظمتوں کی داستان میں ڈھل جاتا ہے۔

آزادی کے متوالوں سیاحوں ملکوں ملکوں سے آئے ہوئے شائقین کا ہجوم ہے جو عقیدت سے ذوق و شوق سے مجسمۂ آزادی کے سائے میں اِرد گرد بینچوں پر بیٹھے ان یادگار لمحات کو تصویروں کی شکل میں اپنی یادوں کے خوشگوار پل کو محفوظ کر رہے ہیں۔ کہ ''ہم یہاں آئے تھے''__ مجھے یووال نوحہ ہراری کی ایک کتاب سیپینز (Sapiens) کا وہ صفحہ یاد آیا جس پر فرانس کے ایک غار سے ملنے والے 30 ہزار پرانے پتھر پر انسانی ہاتھ کا نقش ہے اِس تصویر میں گویا کوئی یہ کہنے کوشش کر رہا ہے کہ ''میں یہاں تھا''__

یووال نوحہ ہراری کی مذکورہ کتاب سیپینز (انسانی ارتقا کی تاریخ) 65 زبانوں میں ترجمہ ہوکر 45 ملین کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے) مجسمۂ آزادی دیکھنے کے بعد ہم پیدل قریبی سڑک پر آئے، جہاں نئی نسل کا ایک نوجوان سِکھ دِل جیت سنگھ روایتی پگڑی سے بے نیاز ہم سب کو لے کر وہاں پہنچا جہاں فیری کا ٹکٹ لینے کے لیے ہم نے اپنی کار پارک کی تھی اور یوں ہم گھر پہنچے جہاں میرے پوتے نائل کی سالگرہ منانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اور جو اپنی بہن کے ساتھ مجسمۂ آزادی دیکھنے میں بھی شریک سفر رہا۔ سالگرہ کے اِس موقع پر جہاں مہمانوں کی زیادہ تعداد اُردو بولنے والوں کی تھی میں نے کہا:

آج نائل وقت کے اُس دھارے پر ہے جہاں ''ٹین ایج'' اور نائل کے درمیان صرف ایک سال یعنی نائنٹین نے آنا ہے۔ سو آج سے اُس کی بھی ابتدا ہوتی ہے پھر ٹین ایج کا سحر اپنی پوری معصومیت کے ساتھ__ ایک اور سال میں ڈھل جائے گا جو بلوغت کا عمل ہوگا۔ یاد رہے کہ انگریزی گنتی کے 20 سے لے کر 100 تک 28 لفظوں پر مشتمل ہے اور اُردو گنتی 100 نئے لفظوں پر مشتمل ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ ٹوئنٹی کے بعد انگریزی گنتی پھر دوبارہ ون ٹو تھری کے ساتھ چلتی ہے جیسے ٹوئنٹی ون ٹوئنٹی ٹو__ یا تھرٹی کے بعد تھرٹی ون تھرٹی ٹو وغیرہ۔

افسوس کہ اُردو بولنے لکھنے والوں یا مسلمانوں نے اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے وہ سب کچھ نہیں کیا جو زبان کی ترقی کا موجب بنتا۔ زبان میں نئے لفظ عمومی طور پر ایجادات کے سبب آتے ہیں اور ایک مدت ہوئی ہم نے کوئی چیز ایجاد نہیں کی ہم صرف معجزوں کے زیرِ اثر رہے۔ ہم نے موجد نہیں مجاور پیدا کیے یا پھونکیں مارنے والے۔ ترقی کے موجودہ تیز رفتار دور میں جب مصنوعی ذہانت __ (A1) Artifiial Intellegent کا عمل جاری ہے اور نہ جانے دوسرے لمحہ کیا چیز معرضِ وجود میں آجائے کہ ہمیں حیرت زدہ ہونے کی صلاحیت بھی کم لگنے لگے تو ایسا وقت

آئے گا اور بہت تیزی کے ساتھ آئے گا اِختلافی امور اور خدشات اپنی جگہ اہم ہونے کے باوجود۔۔۔

ایسا مجھے یقین ہے کہ پہیہ۔۔۔ ذرے کو پھاڑنے کے بعد۔ کمپیوٹر ڈی این اے اور اب مصنوعی ذہانت کے باب میں دنیا کی خوبصورتی میں میل جول ملاپ میں کوئی لمحہ بھی آجائے اور آئے گا (فریبکلی نہ سہی) کہ ہزاروں میل کے کسی حصہ خطہ میں بیٹھا ہوا کوئی اپنا ہمارا بالکل اپنا ہمارے ساتھ چل رہا ہو، ہنس رہا ہو قہقہے لگا رہا ہو ہم سے باتیں کہہ سُن رہا ہو۔ دُنیا کے کسی خوبصورت مرغزار میں کسی دریا سمندر کے کسی حسین ساحل پر ہمارے ساتھ چہل قدمی کر رہا ہو۔

میری خواہش ہے کہ جب انسان سرحدیں، چیک پوسٹ، پاسپورٹ، رنگ نسل اور مذہبی تعصبات یعنی نفرت سے آزاد ہو کر انسان سے ملے۔ ہتھیاروں کے بحرالکاہل اور ہمالیہ کی بلندی سے بھی بلند ہتھیاروں کے تباہ کن انبار مصنوعی ذہانت کے کُن کہنے پر فیکون ہو جائیں یعنی ختم ہو جائیں۔ دنیا میں رہنے بسنے والی کسی قوم کو کسی عالمی جنگ کی ضرورت نہ پڑے۔ امن اور سکون کے ساتھ بہتر سے بہترین کا عمل جاری و ساری رہے۔

میں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے یہاں آیا ہوں کہا جا سکتا ہے کہ میں نے یہ سفر نائل کے اٹھارویں برس کی اِس تقریب میں شرکت کے لیے کیا ہے۔ نائل کا یہ سفر میری نظر میں بچپن کی معصومیت کے اختتام کا سفر ہے اور بقول قرۃ العین حیدر ''اور جاننا چاہیے کہ معصومیت جگنو کی روشنی کی مانند ٹمٹما کر اِس طرح غائب ہو جاتی ہے جیسے وہ زمانہ کبھی تھا ہی نہیں۔''

''مگر وقت ایک ایسی لوحِ محفوظ ہے جس پر وقت کا کوئی اثر نہیں''۔۔۔

خُدا کرے کہ نائل کے لیے ہر آنے والا دن روشن سے روشن ترین ہو وہ ہمارے لیے ہم سب کے لیے قابلِ فخر ہو قابلِ تکریم ہو قابلِ فکر نہ ہو۔

بیٹے نے بیکری اور کافی شاپ کی ایک فرنچائز ''پیرس بیگٹ'' کے نام سے شروع کی تھی ایک سال مکمل ہونے کے موقع پر میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ (انگریزی متن کا ترجمہ)

خواتین و حضرات

پیرس بیگٹ کے محنتی کارکنان

گوقطرے میں دریاؤں کا طوفان سمائے پرشوق کی رُوداد کب الفاظ میں آئے

.....

میرے لیے آج کا دِن عظیم اور ناقابلِ فراموش دِن ہے کہ آج ''پیرس بیگٹ'' کا لذت و خدمت کا ایک سال مکمل ہوا۔ (9 اکتوبر 2023 سے 9 اکتوبر 2024) اِس موقع پر آپ کی موجودگی ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے۔ آپ تمام معززین نیک خواہشات رکھنے والوں اور پیرس بیگٹ میں اپنی خدمت کا موقع دینے والے اپنے

تمام کرم فرماؤں کے شکریہ کے بعد میں اپنے بیٹے خرم اقبال جو اس کاروبار کو ان تھک محنت دیانت اور خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں کی وساطت سے پیرس بیگٹ کے تمام کارکنان کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ وہ اسی طرح روزانہ مسلسل محنت سے کام کرتے رہیں گے۔

اب میں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں کہ میں پاکستان سے آیا ہوں جہاں ایران ہمارا پڑوسی ملک ہے جو اسرائیل فلسطین اور لبنان کے ساتھ محاذ جنگ بن چکا ہے جہاں تقریباً ہر روز مردوں عورتوں اور بچوں کو قتل کر کے فریقین مسئلہ کا حل نکالنا چاہتے ہیں جنگ مسئلہ کا حل نہیں۔ جنگ بذات خود مسئلہ ہے جو مسائل تخلیق کرتا ہے دو جنگ عظیم لڑی گئی اور دونوں کا فیصلہ میدان جنگ کے بجائے میز پر گفتگو سے ہوا۔ قطع نظر اس بات کے کہ جارحانہ قدم کس نے اُٹھایا اور دفاع کون کر رہا ہے میری فریقین سے استدعا ہے کہ خدارا جگنوؤں اور تتلیوں کو زندہ رہنے دو۔

اے انسانو! انسانوں کو مارنا بند کر دو۔

خزاں کا موسم جس پت جھڑ کا موسم بھی کہا جاتا ہے لیکن امریکہ میں ''فال فیسٹیول'' کے نام سے اِسے باقاعدہ منایا جاتا ہے یہ پتوں کو ایک نیا روپ دیتا ہے ایسے ایسے خوبصورت رنگ جیسے فطرت کا مصور ایک ایک پتے کو نیا رنگ دے کر اتنا خوبصورت بنا دیتا ہے کہ دور تک اور دیر تک اُن کے رنگ خوشبو مہک کو آدمی آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں سراہتا ہوا آنکھیں کھول دے نظر بار بار اُٹھائے جیسے شکوہ کر رہی ہوں کہ خدایا اتنی ہی آنکھیں بھی دے اتنی خوبصورتی کا احاطہ اِن دو آنکھوں سے کیسے کروں مختلف رنگوں کی ایک کہکشاں ہے طرح طرح کے خوش رنگ پتے درختوں کی شاخوں پر حدِ نگاہ تک ایسا منظر بناتے ہیں ایسا شاہکار منظر کہ نظریں اُن تمام نظاروں کو بس دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیں کیونکر اِنھیں اپنی یاد کے پنوں میں چھپا لوں ہر درخت کا اپنا ہی رنگ ہے رُوپ ہے جو معصوم سی دھوپ میں کچھ اور بھی نکھر جاتا ہے گویا فطرت نے خزاں کو بھی بہار بنا دیا ہے اور یہ منظر دیکھنے کے لیے لوگ کاروں میں سائیکلوں پر دریا کے کنارے میلوں چل کر دیکھتے ہیں سو پروگرام بنا کہ دارالخلافہ واشنگٹن کی سیر کر لی جائے فال فیسٹیول کے لیے، نیو جرسی سے واشنگٹن 250 میل (امریکہ میں مسافت میلوں میں شمار کی جاتی ہے) دونوں بیٹے میرے ساتھ تھے متعلقین تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے گریزاں سفر رہے۔ سڑکوں کا ایسا خوبصورت نظارہ حدِ نگاہ تک متحرک کاروں کا گویا ایک کارواں ہے جو ہمارے دائیں بائیں چار چار لین کی سڑکوں پر آنے جانے والوں راستوں پہ ایک تنظیم سے اپنی اپنی لین میں رواں دواں کیا مجال کے کوئی کار اوورٹیک کر کے

دوسری تیسری یا___ کسی بھی رو میں چلی جائے وہ راستہ دیتے ہیں اور وقت پر پہنچتے ہیں۔ ہم راستہ روکتے ہیں یعنی ہر متحرک کار، موٹر سائیکل، رکشہ، چنگ چی والے پہلے پہنچنے کے جنوں میں مبتلا آگے ہر ایک سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں مگر جہاں پہنچنا ہے وہاں پہنچتے لیٹ ہی ہیں۔ سڑک کے دونوں اطراف میں دو طرفہ درختوں کے جھرمٹ میں پتوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے گویا فال فیسٹیول مناتے ہوئے ہم رات کو واشنگٹن پہنچے۔ واشنگٹن پہنچتے ہی میریٹ ہوٹل میں 3 کمروں کی بکنگ کرائی گئی تھی ایک ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھایا سفر کی تھکاوٹ کے بعد آرام کی نیند سونا تھکاوٹ دور کرنے کے لیے ضروری بھی تھا تاکہ صبحدم واشنگٹن کو زیادہ سہولت کے ساتھ دیکھا جا سکے۔

میریٹ میں ناشتہ گو ہوٹل کی طرف سے تھا مگر بیٹوں نے باہر ناشتہ کرنے کو ترجیح دی۔ ایک تھوڑی سی مسافت اور بہترین ناشتہ ہمارا منتظر تھا۔

طے کیا گیا کہ نیشنل مال سے قابل دید مقامات کی شروعات کی جائے ایسی جگہوں پر پارکنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے مینار کی سڑکوں کے تین چکر لگائے تیسرے چکر میں اتفاق سے مناسب فاصلے پر پارکنگ مل ہی گئی۔ میرا سفر وہیل چیئر پر بیٹھ کر شروع ہوا۔ نیشنل مال کے یادگاری مینار کے قریب پہنچے اُس کے اردگرد حد نگاہ تک سبزے کی مخملی چادر بچھی ہوئی تھی میں نے اپنے چاروں طرف لوگوں کو دیکھا ہنستے مسکراتے چہرے جو مینار کے نیچے کھڑے سر کو بلند کیے نگاہوں سے اُس کی بلندی چھو رہے تھے۔ خوشی اُن کے طمانیت بھرے چہرے سے اُن کی باتوں سے اُن کے ہاتھوں کی جنبش سے عیاں تھی۔ موبائل کے کیمرے اُنھیں دیکھ رہے تھے جہاں اُن کے عکس محفوظ ہو گئے تھے کسی اور یادگار لمحوں کو یاد دلانے کے لیے اُن چہروں میں میرے دونوں بیٹوں خرم اور فرخ کے چہرے بھی تھے جو باپ کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹوں سے پُرسکون نظر آتے تھے۔ شکر کیا کہ چاروں بیٹے سکون کا ہالہ بنے پاؤں کا چھالا نہیں۔

میں نے یہ پُرسکون مسکراہٹ سان فرانسسکو ایئر پورٹ پر اپنے تیسرے بیٹے حسن کے چہرے پر بھی دیکھی تھی جب میں چند ماہ پہلے اُس سے ملنے گیا تھا۔ نیویارک سے کیلی فورنیا سٹیٹ کا یہ ہوائی سفر ساڑھے سات گھنٹے کا ہے یعنی بحرِ اوقیانوس (Atiantic) دنیا کے دوسرے بڑے سمندر سے بحرالکاہل (Pecific) دنیا کا پہلا بڑا سمندر تک۔ سو تیسرے بیٹے کے بیوی بچوں سے ملاقات ہوئی۔ ایئر پورٹ سے گھر تک بے شمار یادوں کو باتوں میں دہرا گیا اور دو روز کے بعد ہم گاڑی میں باقاعدہ سان فرانسسکو سے ''ملنے'' گئے۔ بیٹے نے بحرالکاہل کی خلیج پر بنے دو رویہ آنے

جانے والے چار چار لین والے راستہ پر گاڑی کا رُخ کیا میلوں لمبے اُس پُل پر سے گزرتے ہوئے انجینئرنگ کے کمالات پر ستائشی جملے ذہن میں گونجتے رہے اور پھر گولڈن گیٹ کی خوبصورتی انجینئرنگ کے کمال فن کی داد میں مدغم ہو گئے۔ ہالی وڈ کی بہت سی فلموں کے سین گولڈن گیٹ پُل پر پکچرائز کیے جا چکے ہیں۔

گولڈن گیٹ کے پُل سے سمندر کی اِک ساحلی سڑک پر ہم ایک تصویر بنانے کے لیے گاڑی سے اُترے تھے۔ بہت سے نوجوان چہرے اُس خوبصورت منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے ڈرون اڑاتے ہوئے نظروں ہی نظروں میں قلقاریاں مارتے ہوئے نوجوان نوخیز لڑکیوں سے بغلگیر ہوتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں سے محبت کا پیغام دیتے ہوئے اردگرد سے بے خبر۔ محبت جب چاہتی ہے اپنے گرد حصار بنا لیتی ہے جہاں اُنھیں گویا کوئی نہیں دیکھتا صرف وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

سان فرانسسکو میں بحرالکاہل (Sacific) کے ساحل پر خوبصورت پھولوں سے سجے دلکش گھر اور سڑکوں کے بہترین نظام کے ساتھ اپنا منفرد مقام اور پہچان رکھتا ہے۔ سیاحوں کے لیے افق کو چھوتی ہوئی عجوبہ روزگار ایک سڑک ہے "لمبارڈ" بل کھاتے ہوئے راستے پھولوں سے مہکتے ہوئے اُس کے فٹ پاتھ بھی سیدھے سیڑھی نما ہیں اور گاڑی چلاتے ہوئے مہارت کی ضرورت پڑتی ہے۔

سان فرانسسکو سے لاس اینجلس جسے پیار سے ایل اے کہا جاتا ہے اور جہاں ڈزنی لینڈ پارک جو ورلڈ آف ونڈر کہلاتا ہے اور جہاں دنیائے فلم کا ہالی وڈ ہے نارتھ کیلی فورنیا کے ایکڑوں میں پھیلے جنگلات ہیں اور جہاں دنیائے فلم کا ہالی وڈ ہے جو تفریح کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام ہے جہاں شاتکلم فلموں سے بھی پہلے فلمیں بنائی جاتی رہیں جہاں ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار فلمیں بنیں۔ ان تمام فلموں نے نہ صرف دلوں پر نقش بٹھایا بلکہ آسکر ایوارڈ کو بھی جنم دیا آسکر ایوارڈ کی تقریبات میں شرکت بذات خود اعزاز ہے چکا چوند روشنیوں سے منور سٹیج نت نئے فیشن کے لباس خاص طور پر فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والوں کے فاخرانہ لباس۔ یوں لگتا ہے رنگوں خوشبوؤں کی قوس وقزح ہے یا خوبصورتی اور حسن کی کہکشاؤں ہے آسکر ایوارڈ کا ملنا ایک اعزاز ہے جسے مل جائے اُس کا رتبہ بدل جاتا ہے۔ ایان فلیمنگ کے ناولوں کو فلمایا گیا اور دنیا کو جیمز بانڈ 007 جیسا کردار ملا جہاں والٹ ڈزنی نے تخلیقی تفریح فراہم کی اور بچوں کے لیے ڈزنی لینڈ بنایا فلمیں بنائیں۔ جب سر آرتھر کانن ڈائل نے دنیائے ادب کو شرلاک ہومز جیسا زندہ رہنے والا کردار دیا اور جہاں اُن پر فلمیں بنائی گئیں۔ جہاں دنیائے فلم کی شاہکار فلموں کے خالق سیسل بی ڈیمل جن

کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ سیسل بی ڈیمل کو کوئی انعام دینا سیسل بی ڈیمل کی توہین ہے، سیمسن اینڈ ڈیلائلہ، ٹین کمانڈمینٹس، قلوپطرہ وغیرہ جیسی فلموں کا ڈائریکٹر، الفریڈ ہچکاک کا نام سسپنس کے حوالے سے دی برڈز، سائیکو، ڈائل ایم فار مرڈر وغیرہ جیسی شاہکار فلمیں۔ ولیم وائلر بن حر۔ رومن ہالیڈے وغیرہ جیسی بڑی اہم فلمیں دنیائے فلم کو دیں۔

1940 میں ٹام اور جیری (ٹام مکیٹ اور جیری، ریٹ) یہ کارٹون فلم بچوں کے لیے بنائی گئی مگر بڑے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اِسے ولیم حنا اور جوزف باربرا نے تخلیق کیا تھا آواز کے بغیر محض حرکات و سکنات سے دیکھنے والوں کو وہ سب کچھ سمجھ میں آتا ہے جو وہ اِس کارٹون فلم میں دکھاتے ہیں 7 مرتبہ آسکر ایوارڈ جیتے اور 6 مرتبہ نامزد ہونے والے ٹام اور جیری کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

دون ریانزا ایکسپریس۔ گنز آف نیوروان۔ ہیلن آف ٹرائے۔ برج آن دی ریور کوائے۔ بن حر، مائی فیر لیڈی، ڈریکولا، ٹائی ٹینک، گلیڈی ایئر، گارڈ فادر۔ ہیری پوٹر کا کردار تخلیق کرنے والی جے کے رولنگ، نیو یارک میں تو ہیری پوٹر کے کرداروں، ہتھیاروں پر مشتمل پوری شوگیلری ہے نوٹ بکس اور کتابوں کے ساتھ کرداروں کے استعمال میں آئی چیزوں کی بھی فروخت ہوتی ہے اور کافی بڑی اِس شوگیلری میں خاص خاص سین بھی باقاعدگی سے دکھائے جاتے ہیں جے کے رولنگ ہیری پوٹر سیریز کے 15 کتابوں کی مصنفہ ہیں اور توقع ہے کہ وہ اِس میں اضافہ کریں گی۔

اداکار چارلی چپلن کا کردار بھی متکلم فلموں سے پہلے اپنی ایک علیحدہ پہچان رکھتا ہے۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اپنی شناخت بنانے والی فلموں کا اعزاز بھی ہالی وڈ نے قائم کیا سپرمین۔ سپائیڈر مین۔ سٹار وار۔ جراسک پارک۔ روبوٹ فلموں سے میرا اختلاف اپنی جگہ مگر ٹرمینیٹر ایک ایسی فلم ہے جو ابتدا سے فلم بین کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور اختتام تک فلم دیکھنے والا اُس کے سحر سے نِکل نہیں پاتا۔ ہالی وڈ کے اداکاروں یا معاون کرداروں کے ذکر کے لیے تو کئی کتابیں بھی کم پڑ جائیں صرف شاہکار فلموں کے نام گنواتے گنواتے صبح سے شام اور پھر رات کے بعد پھر صبح سے شام اور رات ہوتی رہے نام ختم نہ ہوں بس مختصر سے مختصر الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ جہاں ہر روز ایک نئی فلم کی تکمیل ہوتی ہے وہ ہالی وڈ ہے۔

اِسی طرح کیلی فورنیا کے جنگلات جو ہزاروں ہزار ایکڑ میں پھیلے ہوئے ہیں بے تحاشا درختوں سے پٹا پڑا ہے اور طویل القامت درختوں کی وجہ سے بھی دنیا میں اپنا ایک علیحدہ مقام رکھتا ہے ایسے درختوں کا نام گنوانے کے لیے بھی کئی صفحات درکار ہوں

گے۔ تمام ریڈ ووڈ ٹری دیکھنے کے لیے بھی وقت اور ہمت کی ضرورت ہے طویل القامت درختوں میں صرف ایک درخت کا ذکر ہی شاید کافی رہے (Chandelier) شینڈ لیئر ریڈ ووڈ ٹری جس کی اونچائی 315 فٹ ہے اور جس کے تنے کی چوڑائی اتنی بڑی ہے کہ اُس کے اندر سے ساڑھے 6 فٹ چوڑی سڑک بنائی گئی ہے جس میں سے کاریں گزرتی ہیں۔ راہوارِ خیال جانے ابھی کہاں جاتا کہاں پہنچتا کہ میرے بیٹے نے بآوازِ بلند کہا۔ ابو جی ___!

میں کیلی فورنیا سے پھر واپس، نیشنل مال واشنگٹن میں آ گیا وہاں تو میں اپنے قدموں سے اور گاڑی میں جا کر اُن تمام مقامات کو دیکھ رہا تھا سیر کر رہا تھا یہاں میں وہیل چیئر پر بیٹھا ہوں وقت زندگی کا وہ استعارہ ہے جو کثرتِ استعمال سے آدمی کو اُس کی سوچ کو ___ ”اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی“ میں بدل کر بھی شاید مطمئن نہیں ہوتا اور ایک بے نام سی اُداسی یادوں کا اک موہوم سا عکس دل کے اندر ایک طلاطم سا بپا کر کے اُس کی گہرائی میں جا کر خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔

بیٹوں نے وہیل چیئر کا رُخ لنکن میموریل کی جانب موڑ دیا یہ خاصا طویل فاصلہ تھا درمیانی راستہ پر ایک کشادہ سڑک اور درختوں کے درمیان ہم ایک کھلے داخلی راستہ پر پہنچے اُس راستے کو لمبی راہداریوں اور قدرے بلند سطح دیواروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نیشنل مال کی اِن راہداریوں کی دیواروں کو آزادی کے لیے لڑنے والوں کی اُبھری ہوئی دھاتی منقش تصویروں سے سجایا گیا ہے۔ آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے چہرے اُن کے ہتھیار اُن کی جدوجہد بہادری اُن کا جوش و جذبہ دھات پر منقش کیا گیا ہے۔ اپنے اسلاف کے کارناموں پر مشتمل یہ دیواریں اُبھری ہوئی دھات پر کمالِ فن کا نمونہ بن گئی ہیں اور دیکھنے والوں کو اُس دور میں لے جاتی ہیں جہاں وہ خود آزادی کی جنگ کا حصہ بن جاتے ہیں گویا ہر تصویر تاریخ بن گئی ہے۔ اور پھر فوراً ہی ___ پورا امریکہ علامتی شکل میں ہمارے سامنے آ جاتا ہے ایک مستطیل شکل میں کہ بائیں طرف دنیا کا سب سے بڑا سمندر بحرالکاہل (Pacific) اور دائیں طرف دنیا کا دوسرا بڑا سمندر بحرِ اوقیانوس (Atlantic) دونوں سمندروں کو ایک بلند سطح ستونوں سے ظاہر کیا گیا ہے بحرالکاہل کے قرب میں امریکہ کی ریاستوں سان فرانسسکو لاس اینجلس وغیرہ نسبتاً چھوٹے ستونوں پر ریاست کا نام اور آزادی کے صلے میں سنگی پھولوں کے گجرے نما سلامتی ہار اور اِسی طرح بحرِ اوقیانوس کی جانب امریکہ کی ریاستوں جیسے امریکہ کی پہچان نیویارک جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ شہر سوتا نہیں چوبیس گھنٹے جاگتا جگاتا اور جگمگاتا ہے دنیا بھر سے آنے والے لوگوں کا خیر مقدم کرتا ہے اور اُس کا دارالخلافہ واشنگٹن جہاں ابراہام لنکن کا مجسمہ اونچائی پر ایستادہ گویا

پورا امریکہ دیکھ رہا ہے اُن تمام ریاستوں کو بھی علامتی طور پر جن کے لیے چھوٹے ستون، ریاست کا نام کھُدے نما ہار پر نئے ایک منظر ہے جو خوبصورت بھی ہے اور تاریخی بھی۔ لنکن میموریل کو اور مستطیل شکل میں ان تمام ریاستوں کو بلند ستونوں کی شکل میں دیکھنے کے بعد ایک کافی لمبے مگر پُرسکون تالاب کے کنارے دائیں بائیں ہر دو جانب دو رویہ سڑک اور پیدل چلنے والوں کے لیے دو شاندار گزرگاہیں جہاں فاصلے فاصلے سے بنچ رکھے گئے ہیں میں وہیل چیئر پہ جسے بار بار میرے دونوں جوان بیٹے چلا رہے ہیں سے اُتر کر پیدل چل کر ابراہام لنکن کے مجسمہ کو دیکھنے کی خواہش پر قابو نہ پاسکا، اُترا او پھر ٹانگوں نے سمجھایا__ جان اب تم جوان نہیں رہے فاصلہ کافی طویل اور بلندی پر ہے سو اونچائی کی طرف رواں چبوترے کی گزرگاہ پر وہیل چیئر سے ابراہام لنکن کے مجسمے پہنچا جس کے گرد زنجیر دیکھ کر خیال آیا کہ اب احترام کا لمحہ آ گیا ہے۔ ایک بورڈ پر احتراماً خاموش رہنے کی عبارت بھی نظر آئی۔ فرمودات بھی ہر دو جانب کی دیواروں پر کندہ تھے۔ آزادی کے کلمات یاد رہنے اور یادگار بننے والے پُرجوش الفاظ پڑھے اُن لوگوں کو یاد کیا جو اُس وقت زندہ تھے وہ آج بھی زندہ ہیں۔ اس لیے کہ آزادی حاصل کرنے والوں کو موت تو آتی ہے تا کہ وہ لوگوں میں زندہ رہیں۔

پورے تاریخی منظر اور پس منظر میں تقریباً زیادہ مقامات کو دیکھنا تھا جو دیکھا گیا۔ کانگریس لائبریری کو اندر سے دیکھنا میری انتہائی خواہش تھی مگر اتنے کم وقت میں دنیا کی سب سے بڑی لائبریری کو دیکھنا ممکن نہ تھا سو اُسے باہر سے دیکھ کر اپنے شوق کو پورا کر لیا۔ نیشنل میوزیم آف امریکن ہسٹری پہنچے تو اندر داخل ہونے کا جو وقت معلوم ہوا اُس سے ہم بہت مشکل میں پڑ گئے کہ اتنے کم وقت میں اتنی دیر انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے وائٹ ہاؤس دیکھنے کی بھی تمنا تھی سو اُسے دیکھا کچھ زیادہ لطف آیا بہت سی حکومتی عمارات اُس کے گرد و نواح میں دیکھیں۔ میں سوچنے لگا یقیناً وائٹ ہاؤس کی عملداری ترقی پذیر ملکوں میں اُس کے احکامات کو اپنے احکامات بنا کر پیش کرنے کا ہنر دنیا کے بیشتر ممالک کو آتا ہے برطانیہ کے وائسرائے تو اب قصۂ پارینہ بن گئے ہیں__ مگر امریکہ کے احکامات وائسرائے بن گئے ہیں اب وہ اسلامی ممالک کے محلات ہوں یا پارلیمنٹ ایک ایک وائٹ ہاؤس اُن سب کے لیے بھی ضروری بنا دیا گیا ہے سو وائٹ ہاؤس کو دیکھا اور خوب دیکھا۔

حلال کھانا کھانے کے لیے ''گوگل'' کی مدد لی گئی اور شکم پُری کے بعد ہر چیز زیادہ خوبصورت لگنے لگی فاصلے اُتنے ہی تھے مگر کم نظر آنے لگے۔ بھوک انسان کی پیدائش سے شروع ہوتی ہے اور ''خواب تھا جو کچھ کے دیکھا جو سُنا افسانہ تھا'' پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

طارق نعیم کی شعری دنیا ''آنکھ سے آسمان جاتا ہے''

اقبال کا ایک شعر ہے:

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے نہ قفس نہ آشیانہ

.....

یہ شعر کائنات کی بے کرانیوں میں انسان کے وجودی احساسِ محبوسیت کو سامنے لاتا ہے جو اس کی روح میں موجود کسی لامکانی جوہر کی نشان دہی کرتا ہے۔ اقبال کی عظیم شعری واردات تو جملہ درجات حقیقت کو محیط ہے اور وہ اپنی ذات میں اکثر و بیشتر وجود اور ماورا کے جزر و مد سے گزرتا رہا ہے۔

گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

.....

اور فکر و احساس کی یہ معراج و مراجعت اس کی شعری واردات کو جہاں بینی سے بہت آگے جہاں سازی کے معجز نما منصب پر فائز کرتی ہے۔ ایسا اعجاز تو قدرت صدیوں میں کسی کو عطا کرتی ہے۔ تاہم کسی شاعر کے ہاں محض سطحی مضمون تراشیوں کی پھلجھڑیاں چھوڑنے یا ہجوی کیفیات کی اشتعالی بارود بازیوں سے اوپر اٹھتے ہوئے اس شش جہاتی حصار کو توڑ کر بے کراں ہونے کی طبعی و نا ساختہ امنگ پائی جاتی ہو تو یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ مجھے طارق نعیم کی شاعری میں ایسے ہی خصوص و انفراد کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس پر اس کا منجھا اور سنبھلا ہوا انداز اظہار اس کی غزلوں کو اور بھی پُرکشش بنا دیتا ہے۔ اس خداداد استعداد کی حفاظت و پرورش میں اس کی درویش منش طبیعت کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ الفاظ کو اپنے مطلوبہ شیڈز کی مناسبت میں برتنے کے شعور و سلیقہ سے مالا مال ہے۔ شدتِ احساس کی اپنی قوت تو راست اظہار کے عجز کو بھی اعجاز بنا دیتی ہے، مگر سوچتی ہوئی کیفیات کے لیے ایمائی پیرایۂ بیان زیادہ موزوں رہتا ہے۔ طارق نعیم نے بیشتر اسی سے کام لیا ہے اور کیا خوب وعدہ کام لیا ہے۔ ردِعمل اور برافروختگی کی شاعری کے اڑائے ہوئے گرد و غبار میں طارق نعیم جیسے گنتی کے نرم خو اور سلامت رو شاعر زمانے کی بے توجہگی کا شکار رہتے ہیں۔ اسی لیے اسے بھی کہنا پڑا کہ:

شعر میرے ہی کرائیں گے تعارف میرا
ذکر یاروں نے اگر تنگ بیانی سے کیا

.....

اس کے تین شعری مجموعوں ''وقت کا انتظار کون کرے''، ''دیے میں جلتی رات'' اور ''رکی ہوئی شاموں کی راہداریاں'' پر مشتمل کلیات ''آنکھ سے آسمان جاتا ہے'' سے اس کے حال و ہنر کی نمائندگی کرتے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اڑان روک کے یکدم مجھے گزرنا پڑا
پروں کے زور سے ورنہ یہ آسماں گیا تھا

جلیل عالی

تم آئے تھے تو مجھے مل کے ہی چلے جاتے
یہیں زمین پہ تھا اور میں کہاں گیا تھا

تو کہیں اور ڈھونڈتا ہے مجھے
میں کسی اور ہی جہان میں ہوں

زمین چاہیے تجھ کو تو یہ پڑی ہے زمیں
مجھے تو خود بھی بہت ہیں تحفظات یہاں

بہت قدیم رفاقت کے باوجود اب بھی
زمیں کی بات ہمیں آسماں بتاتا ہے

دکھا تو لاؤں تجھے بھی جہانِ نادیدہ
مری اڑان میں اس سے مگر خلل پڑے گا

پیڑوں سے پوچھتے ہیں کہ عزیزانِ من کہو
جب شام ڈھل چکے گی تو سایہ کرو گے کیا

گیا ہوا ہوں کسی اور آسمان پہ میں
زمیں تو کیا مرا خود سے بھی رابطہ نہیں ہے

پھر کسی وقت ملاقات کہیں رکھتے ہیں
آج تو مہر ملاقات کو آیا ہوا ہے

اے کاش کوئی ہم کو بھی آ کر سنبھالتا
کب کے پڑے ہیں صورت گیہوں گھے ہوئے

اب وہی پیڑ کاٹنے والے
کاغذوں کے شجر بناتے ہیں

مرے لیے تو خلا جست بھر کا قصہ تھا
اڑا ہی تھا کہ خلا کی کہانی ختم ہوئی

دیکھئے راستہ دیتا ہے کسے یہ دریا
آپ بھی رکھیے قدم ہم بھی قدم رکھتے ہیں

لا مکاں تو رستے میں اک مکان پڑتا ہے
اس سے آگے جاتے ہیں سلسلے مکانوں کے

پڑنے لگا تھا ایک خلل سا اڑان میں
رستے سے آسمان ہٹانا پڑا مجھے

بہت گہرے روابط ہیں یقینوں اور گمانوں میں
حقیقت کے سبھی رستے سرابوں سے نکلتے ہیں

ہو کے آتا ہوں لا مکاں سے میں
وہ اگر آئے تو کہو بیٹھے

یوں ہی تو کنجِ قناعت میں نہیں بیٹھا ہوں
خسروی شاہجہانی مری دیکھی ہوئی ہے

جمال مجھ پہ یہ اک دن میں تو نہیں آیا
ہزار آئنے ٹوٹے مرے سنورتے ہوئے

میں جہاں سے گزر کے آیا ہوں
راہ میں لا مکاں پڑے ہیں مرے

بہت سے تیر پروں میں تھے اور گرتے ہوئے
اک آسمان پرندے کی آنکھ سے نکلا

زمانہ جتنا بھی چاہے خراب ہو لیکن
جو اچھا ہو اسے اچھا دکھائی دیتا ہے

کوئی چراغ جلا ہو گا اس کے ہاتھوں سے
ہوا کی بات بھی یوں ہی نہ ٹال دی جائے

پتا تو ہوتا ہے سب کو یہاں نہیں رہنا
زمیں پہ پھر بھی ٹھکانے بنانے پڑتے ہیں

غضب کا بُعد ہے اس کے مرے خیالوں میں
زمیں کی بات کروں میں تو آسماں بن جائے

☆☆☆☆☆

غضنفر ترمذی کی غزل پر طائرانہ نظر

جھنگ میں شاعری کی وہ روایت جو بہت توانا رہی ہے اور جو حضرت سلطان باہو سے شروع ہو کر حضرت صدیق لالی اور میاں عمر سے ہوتی ہوئی ماضی قریب کے ان بڑے شاعروں تک پہنچتی ہے، جن کے نام کچھ اس طرح سے ہیں۔ جناب مجید امجد، جناب جعفر طاہر، جناب شیر افضل جعفری، آغا نو بہار علی خاں، جناب ظفر ترمذی، جناب رفعت سلطان، جناب بیدل پانی پتی، جناب رام ریاض، جناب مظہر اختر، جناب معین تابش، جناب ممتاز بلوچ، جناب احمد تنویر، جناب شفیع ہمدم، جناب مظفر علی ظفر، جناب سجاد بخاری، جناب خادم مگھیانوی، جناب سجاد بخاری، جناب حکمت ادیب، جناب سارب انصاری تک پہنچی۔ اب اس روایت کو موجودہ دور کے چند بڑے نام اپنے ہاتھوں میں لے کر اُسے آگے بڑھانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ ان بڑے ناموں میں جناب غضنفر ترمذی بھی شامل ہیں، جو انھیں لوگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے غزل گوئی میں اپنا نام پیدا کر رہے ہیں۔ ہاں، میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ان کا قلم غزل کے میدان میں ان شاعروں کے اس عظیم جمگھٹے کے ہم رکاب ہوتے ہوئے بھی اپنے الگ جوہر دکھا رہا ہے۔ ان کی غزل چھوٹی بحر میں ہوتے ہوئے بھی فنی پختگی کے ساتھ ساتھ معنی خیزی کی حامل ہوتی ہے۔ غضنفر شعر کہتے وقت لفظوں کے چناؤ کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کو پڑھتے ہوئے قاری جس لطف سے ہم کنار ہوتا ہے اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ان کی غزل کی یہ خوب صورتی ان مفاہیم کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے جو غزل کے بطون سے ظاہر ہو کر قاری سے باتیں کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ غضنفر ترمذی سے میری یہ گزارش ہے کہ وہ نظم نگاری کی طرف بھی توجہ دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے لیے اس صنف سخن کی حدود تک پہنچنا کوئی اتنا مشکل نہیں کیونکہ ان دونوں اصناف کا درمیانہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں بس آپ کو نظم کی جانب ایک قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے۔

اب میں یہاں آپ کے لیے غضنفر ترمذی کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن سے ہو سکتا ہے مندرجہ بالا کہے ہوئے حروف سے جھلکتے میرے خیالات کی تصدیق ہو جائے:

دیکھ کر بھیڑ غضنفر نے ارادے بدلے
ضبط کا ''داغ سرِ عام دھویا نہ گیا

.....

اس شہر کے باسی کچھ ایسے ہیں غضنفر جو
تعریف تری کر کے دشنام بھی کرتے ہیں

.....

غم کی دنیا تیرے انداز بدلتے دیکھے
رات مانے تو خفا صبح کا تارا ہو گا

.....

عید تھی شہر میں ہم اشک سجا کر نکلے
تھے ستم حسرت ناکام پہ کیسے کیسے

☆☆☆☆☆

حنیف باوا

نوید صادق ---- اِس دورانیے کا شاعر

''دورانیہ'' نوید صادق کی اٹھاون (58) نظموں کا مجموعہ ہے جو گزشتہ پچیس تیس سال کے دوران تخلیق کی گئیں۔ نوید صادق کی نظمیں کئی پہلوؤں سے دوسرے نظم نگاروں کی تخلیقات سے الگ دکھائی دیتی ہیں اور مختلف انداز سے سمجھی جا سکتی ہیں۔

سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ نوید صادق کی شناخت کا سفر غزل کے ذریعے آغاز ہوا اور انھوں نے دو دہائیوں کے بعد غزل میں اپنا ایک انداز دریافت اور متعین کر لیا۔ یہی کہانی مجھ سمیت تقریباً سارے غزل نگاروں کی ہوتی ہے لیکن اس کہانی میں ایک اگلا موڑ آتا ہے اور وہ بھی بیشتر تخلیق کاروں کی کہانی میں ممیز نہیں کیا جا سکتا یعنی میں ذکر کر رہا ہوں غزل سے نظم کی طرف اظہار کے نوع کے تبدیلی کے سفر کی۔

غزل سے نظم کی طرف آنے والے بیشتر شعرا کی نظموں میں بھی غزل گوئی کی سی صفات اور کیفیات در آتی ہیں۔ بہت سے ایسے لکھنے والے نظمِ معریٰ تک ہی محدود رہتے ہیں اور اگر وہ اس منزل سے آگے نکلیں تو بھی ان کی علامات، تراکیب اور ڈکشن کے دیگر عناصر (جیسے مخصوص تلازمہ کاری) ان کے غزل نگار ہونے کے چغلی ضرور کھاتے ہیں۔ ممکن ہے آپ اسے عیب نہ گردانیں لیکن اتنا تو ہے کہ یہ صورتحال ان تمام تخلیق کاروں کی نظموں میں یکسانیت کا تاثر ضرور پیدا کرتی ہے اور ایک قدم آگے بڑھ کر بعض صورتوں میں اظہار کا یہ نظام فکری فرسودگی کی جانب بھی اشارہ کر سکتا ہے۔ یہ وہی نکتہ ہے جسے اکثر غزل کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔

اس لمبی تمہید کا لبِ لباب یہ باور کرانا ہے کہ نوید صادق کی نظم ان کی غزل سے اتنے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے کہ ان میں بظاہر کوئی ایسی قدرِ مشترک تلاش کرنا کارِ محال ہے۔

اُن کی نظم نگاری کی دوسری خاصیت اس کی تھمبیرتا ہے۔ نوید صادق کی نظمیں ایسی نہیں ہیں کہ آپ کے اندر نصب قوافی اور دیگر صوتیاتی آلات کی مدد سے موسیقیت کا لطف آسانی سے لے سکیں۔ مزید برآں وہ زبان کے معاملے میں بھی ایسے کسی اہتمام کے قائل نہیں ہیں جس سے مصرعوں کی شان و شوکت جھلکے۔ وہ مصرعہ سازی میں دقت نظری نہیں دکھاتے گویا زبان میں سلاست کے قائل ہیں لیکن یہ سلاست ان کے ہاں محض سادہ کاری نہیں رہ جاتی بلکہ بیان کی ان وسعتوں تک رسائی حاصل کرتی ہے جس کے

رحمان حفیظ

لیے شوکتِ الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے۔
ہم اس نکتے پر مزید بات ان کی ایک دو نظموں کی مثالوں کے ساتھ کریں گے لیکن اس سے پہلے ان کے موضوعات کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔
اگر پوری کتاب پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو لگ بھگ پانچ درجن نظمیں پڑھنے کو ملتی ہیں اور ان کے عنوانات کی فہرست پر ہی ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر کے موضوعات کیا ہیں۔
تقریباً ایک تہائی نظموں کے موضوعات میں لفظ 'میں'، 'میرا' یا 'اُس' کے متعلقات آتے ہیں۔ اور کئی موضوعات بباطن اسی قبیل کے ہیں یا نوید کی پسندیدہ شخصیات، متعلقہ واقعات وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ فطری، کائناتی اور آفاقی مظاہر پر الگ سے بہت کم عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مجھے بظاہر کچھ مایوسی ہوئی لیکن اس کا جواب مجھے پے در پے ان کی کئی نظموں کے بار بار مطالعے اور بعد ازیں ان کے تجزیے سے ملا۔
مثلاً کتاب کی پہلی نظم ''میں داستانوں کا آدمی ہوں'' سے آغاز کیا تو ابتدا میں وہی تحفظات سامنے آئے۔

نظم: میں داستانوں کا آدمی ہوں

میں شام سے پیش تر
یہاں سے
چلا ہی جاؤں
تو ٹھیک ہوگا

سنا ہے
گھر میں کہیں بھی کچھ بھی نہیں ہے
لیکن!
یہ کاروبارِ زمانہ مدت سے چل رہا ہے
یہ پیڑ پودے قدیم تر ہیں
یہ نہر کے داہنے کنارے
یہ بوڑھا برگد!
چلو ذرا آج اس سے پوچھیں

یہ کون لوگوں کے مسکنوں کے کھنڈر ہیں بھائی!
یہ کون لوگوں کے معبدوں کی نشانیاں ہیں
یہ بوڑھا برگد بتائے شاید!

میں دادی اماں سے پوچھتا ہوں
ہمارے آنگن میں پہلے پہلے جو اک شجر تھا
وہ کیا ہوا ہے
وہ پیڑ جڑ سے اکھڑ گیا تھا
کہ میرے ابا نے کاٹ ڈالا تھا
کیا ہوا تھا؟
جو بات سچ ہے وہی بتائیں

مجھے یونہی آج بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اس شجر کو
ہمارے پرکھوں کی سب خبر تھی
وہ جانتا تھا
کہاں کہاں سے یہ داستانیں اُلٹ گئی ہیں

میں داستانوں میں جی رہا ہوں
میں کیسے کہہ دوں
کہ کوئی نغمہ بہار آور تھا اُن دنوں جب۔۔۔
کسی کی آنکھوں میں آنسو آتا تو ایسے لگتا کہ
سارے گاؤں

میں جیسے ماتم بپا ہے کوئی

کہیں خوشی کی نوید ہوتی تو سات گاؤں تلک
ہواؤں میں رنگ اُڑتے تھے
دودھ بٹتا تھا

یہ ساری باتیں میں سنتا آیا ہوں
دادی اماں سے، اپنی ماں سے

میں داستانوں میں جی رہا ہوں
میں کیا بتاؤں
کہ میرے دائیں طرف کے گھر میں جو لوگ رہتے ہیں
کون ہیں وہ؟

انھیں بھی شاید خبر نہ ہوگی
میں داستانوں کا آدمی ہوں!

.....

نظم پڑھ کر بظاہر سارا دھیان 'ناسٹلجیا' کی جانب جاتا ہے لیکن چند بار کی قرأت سے کھلا کہ نہیں، نظم کا تو آغاز ہی اجتماعی احساسِ زیاں سے ہو رہا ہے البتہ یہ افسانہ دھیرے دھیرے، سمٹتے سمٹتے شہر، گلی، محلے کی سماجیات سے گھر کے آنگن کی باتیات اور آخر کار شاعر کی ذات پر آ کے ختم ہوتا ہے۔
اب کتاب کی دوسری نظم " لیکن میرا دم گھٹتا تھا" کو دیکھئے۔
نظم: لیکن میرا دم گھٹتا تھا
ایسا بھی اک قصہ ہے جو
مجھ تک تم سے پہنچا ہے

خالی ہاتھوں، خالی دامن، جھول بھرے الفاظ
لیے میں اُس دہلیز پہ آ بیٹھا ہوں
جس سے آگے سارے جھگڑے مٹ جاتے ہیں

یہ بھی تم نے بتلایا تھا
یہ جو میرے ماتھے پر کچھ آڑھی ترچھی۔۔۔
لیکن میں یہ باتیں تم سے کیوں کرتا ہوں
تم نے کوئی۔۔۔
تم نے کوئی ہاتھ پکڑ کر۔۔۔
سچ بتلانا
آج تلک اِس دنیا میں
لیکن۔۔۔
پہلے یہ بتلاؤ
پہلے شخص اور آخری فرد میں
تہذیب و تاریخ کے جھگڑے
میری توبہ!
آج اگر میں اپنے آپ سے بچ کر
اُس تک پہنچ گیا تو
دونوں ہاتھ اٹھا کر۔۔۔۔۔
لیکن یہ سب جھگڑے تو میں رستے میں چھوڑ آیا تھا
یاد آیا
میں اپنی خاطر پہلے پہل سب چھوڑ آیا تھا
جنگل کے باشندے خوش تھے
پیڑ پرندے ایک عجب سرشاری میں تھے
لیکن میرا دم گھٹتا تھا
دل پر کوئی بوجھ تھا
جس نے میرے سارے ارادوں کو شل کر رکھا تھا
اندر باہر تاریکی کی فصل بچھی تھا
ذہن بہت مفلوج تھا گویا
دیکھنے والے، سننے والے صرف پرندے اور شجر تھے
جاننے والے جانتے ہیں،
اس عالم میں کوئی کہاں تک چل سکتا ہے
تم بھی اتنا جانتے ہو!

اس قصے کی کچھ کڑیاں تو آج بھی گم ہیں
تم نے بتلایا تھا
ایک بڑے طوفان کے بعد
بس ایک پرندہ، ایک شجر اور چند شکستہ لمحے
میرے ساتھ چلے تھے
محرومی کی جھلمل فصلیں
جھوٹے قصے،
تہذیب و تاریخ کے جھگڑے۔۔۔!
میں دفتر کی کھڑکی سے سب دیکھ رہا ہوں!

.....

چار صفحات کی یہ نظم بھی کربناک ہے جس میں گہرا فکری اور نفسیاتی کرب بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ نظم بھی نہایت ذاتی احساس پر مبنی لگی تاہم جب تنقیدی اصولوں کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا جائے تو کئی دوسرے پہلو بھی سامنے آتے ہیں خاص طور پر جب اِسے کھلے متن کے نئے تنقیدی اصول کے تحت پڑھا جائے اور سمجھا جائے جسے، اوپن ٹیکسٹ بھی کہا جاتا ہے۔

مثلاً اگر وجودیت کے تناظر میں دیکھیں تو یہ نظم ایک کشمکش کی عکاس ہے جس کے فریقین میں ذات، تاریخ، عقائد اور سماجی عوامل سب کی کارفرمائی ہے۔ اسی طرح اگر پوسٹ ماڈرن ازم کی بات کی جائے تو معنی کی تکثیریت اس کی خاصیت ہے مثلاً یہ نظم شاعر کے داخلی یا ذاتی وجودی کرب کی غماز تو ہے لیکن دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو یہ انسانی تہذیب اور تاریخی جبر سے انفرادی آزادی کا منظرنامہ بھی لگتی ہے۔

موضوع آفرینی اور معنی پروری کے یہ کمالات قُاری مرکزیت'' کے فلسفے کے مرہونِ منت ہیں یعنی نظم کے حتمی مآل و ماحصل کا اختیار خود قاری کے ذہن کو دیا گیا ہے اور اسے کھولنے اور اس سے استفادہ کا زیادہ حق بھی اسی کے پاس ہے تاہم اس تھیوری سے استفادہ کی سہولت بالکل یک سطحی اور جانب دارانہ تخلیقات نہیں دیتی۔ قاری کے لیے یہ سخاوت اکثر تخلیق کاروں کے پاس دستیاب نہیں ہوتی۔

ان دو نظموں سے اخذ کردہ منطق کے ساتھ میں پوری کتاب پڑھتا چلا گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ نوید صادق کی سادہ روی ایسی سہل انگارانہ بھی نہیں ہے کہ ہر کوئی اس متن کا پیراک بن جائے۔ کیونکہ ان نظموں کی زبان سے فکر کی گہرائی اور مدعا کی بسیطگی کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے بین السطور کی تہ میں اترنا پڑتا ہے۔ کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر قاری کو کہیں چھوڑ کر خود غائب ہو گیا ہے لیکن پھر قریب ہی کوئی چمکتا عکس، کوئی سسکتی آواز یا سرکتی ہوا کی طرح کا ایسا احساس گرفت میں آتا ہے جو تجزیے کا اگلا مرحلہ سجھا دیتا ہے۔

ابہام کی یہ قوت ہر نظم نگار کے مقدر میں نہیں جو نہ صرف معنی کی تکثیریت میں سہولت فراہم کرتی ہے بلکہ طبعِ سلیم کے لیے یہ اور حیرت کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔

نوید کی تخلیق کاری ایک نوع کی خود کلامی ہے جو آدھی شاعر پر منکشف ہوتی ہے اور آدھی قاری پر اور آخر کار دونوں مل کر نظم بنا لیتے ہیں۔ نظم کا یہ انداز دیکھ کر مجھے نوید کے کسی دوسرے معاصر نظم نگار کی یاد نہیں آتی۔ اس لیے میں سہولت سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ نوید نظم کا ایک صاحبِ اُسلوب شاعر ہے۔

☆☆☆☆☆

بات کہہ جاتا ہوں میں سادہ بیانی میں ندیم

ریاض ندیم نیازی سبی کے سنگ لاخ پہاڑوں اور دہکتی فضاؤں سے اُبھرتی ہوئی ایک ٹھنڈی میٹھی آواز ہے۔ وہ قدیم اور جدید کے سنگم پر ایستادہ اپنے عہد کا عکاس اور خوش آہنگ سخن ور ہے جو اپنے زخموں کی کستوری میں درد و غم سمو کر غزل کی رسیلی بانہیں پھیلائے چلا جا رہا ہے۔ اس کے گلشنِ سخن میں جذبوں کی خود کار چمن آرائی ہے اور اُس کے دامن میں خلوص اور محبت کی خوش بو دار کلیاں ہیں۔ وہ احساس اور تخیل کے باہمی عمل سے سخن کی مہک پھیلاتا ہے اور۔۔۔ بہ قول انور سدید ''پتھروں سے پھول اُگاتا ہے''

غزل کاری کا رس کشید کرتے ہوئے ریاض ندیم نیازی پہیلیاں نہیں بجھواتا سیدھے سبھاؤ انداز میں ہم تک اپنے احساسات پہنچاتا ہے۔ مختصر بحر میں اُس کی ایک غزل کے اشعار دیکھیے:

روٹھنا تو ہم کو تھا
وہ مگر خفا نکلے
میرے گھر کے رستے میں
اُس کے نقشِ پا نکلے

ہم نے مُنہ نہیں کھولا
جانے منہ سے کیا نکلے

ریاض ندیم نیازی کی سادگی میں پُرکاری ہے اور سادہ بیانی کی روانی ہے۔

کیا ہے ہم نے تجھے منتخب زمانے میں
اب اِس کے بعد ترا انتخاب دیکھتے ہیں

.....

جسے دیکھو وہ گھبرایا ہوا ہے
یہاں ہونا ہے یا کچھ ہو گیا ہے

.....

ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم لیکن
جسے دیکھو ہمی سے پوچھتا ہے!

.....

بات کہہ جاتا ہوں میں سادہ بیانی میں ندیم
ہے یہ اِک رمز کہ مشکل مرے اشعار میں ہے

.....

ریاض ندیم بلوچستان کا باسی ہے سو خون گرم مگر لہجہ حد درجہ نرم رکھتا ہے۔ بات بھلمنساہٹ سے کرتا ہے اور اپنے اندر کے جوار بھاٹے کو کسی آتش فشاں لاوے کی طرح اُبل کر باہر آنے سے گریزاں رہتا ہے۔ کلام کرتا ہے تو دُلار سے، وضع داری کے ساتھ۔ تہذیبی رچاؤ میں گھول کر، شعر کہتا ہے تو سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ اپنا دل بھی اپنے اشعار میں پرو کر رکھ

شجاعت علی راہی

دیتا ہے اور لفظ روئی کے گالوں پر رکھ کر پیش کرتا ہے۔ کرب کے عالم میں بھی سکون اور قرینے کا سرچشمہ ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتا:

اُس کو اپنی ہر غزل میں بُن رہا ہوں لفظ لفظ
اور ہر انداز سے پھر چُن رہا ہوں لفظ لفظ

....

سیاسی شعور ریاض ندیم نیازی کے اندر کچھ ایسا رچا بسا ہُوا ہے کہ اُس کے پرانے اشعار بھی نئی بچھتی ہوئی بساطِ سیاست پر محیط ہیں۔ وہ طبقاتی سماج کے چھل کپٹ سے شناسا ہے اور جانتا ہے کہ وہ منافقوں کی بستی میں بس رہا ہے لیکن بات قرینے سے کرتا ہے:

دلوں کے احوال سے سب آگاہ ہو چکے ہیں
کہ صرف لفظوں کی مہربانی نہیں چلے گی

....

پھر سوچیے بنے گا کہاں اور کس طرح
گھر کا حضور پہلے تو نقشہ بنائیے

....

کچھ اقربا ہیں میرے ذخیروں کے پاسباں
بھوکے ہیں کتنے لوگ مرے خاندان کے

....

ہم زباں رکھتے ہیں مُنہ میں، یہ خبر رکھتے ہوئے
مُدّتوں دانستہ ہم کو بے زباں رکھا گیا

....

جو مُنصف ہو اگر مُنصف تو پھر صحنِ عدالت میں
کفِ قاتل پہ دھبا بھی لہو کا بول سکتا ہے

فضا کے خوف سے خاموش بیٹھے ہیں سبھی، لیکن
اچانک کوئی بچہ بے ارادہ بول سکتا ہے

بگولے بھی ہماری بات کی تائید کرتے ہیں
زبانِ حال سے خاموش صحرا بول سکتا ہے

....

ریاض ندیم نیازی اُس دنیائے خستہ حال کا عکاس ہے جہاں بے چارگی میں لوگ اپنے سپنے، لاشوں کے کفن، بیٹیوں کے گہنے اور رشتے فروخت کر دیتے ہیں اور:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی بھوک کی خاطر
پریشاں حال بچے اپنے بستے بیچ دیتے ہیں

....

بلوچستان کی عظیم وادی کا یہ حساس سخن گو ایک عرصے سے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ شکستہ اقدار کا یہ مرثیہ خواں سنہرے مستقبل کی بشارت لیے مسلسل عالمِ سفر میں ہے۔ اپنے عہد کا یہ ترجمان ثقافتی خزینے اپنی پشت پر دھرے سراپا غزل خواں ہے اور نت نئے مضامین کا انبار لیے نئی منزلوں کی طرف رواں دواں ہے۔ ریاض ندیم نیازی وہ طائر ہے جو زمینی خُو بُو رکھتے ہوئے بھی اونچی اُڑان کا عادی ہے۔ اس کی چشمِ بصیرت میں ایک وسیع و عریض آسمان چھپا ہُوا ہے:

زمانہ اِس کو سمجھتا ہے اپنا افسانہ
ندیم کچھ بھی اگر ماجرا لکھوں اُس کا

....

مہمان نوازی اپنے قبیلے کی ہے سرشت
رکھتے ہیں ہم ہمیشہ مدارات کا خیال

....

وہ تھا خود اپنی ہی وسعت میں کتنا لامحدود
جو آسمان پرندے کی آنکھ سے نکلا

☆☆☆☆☆

تنکے کا باطن سے نیلگوں کائی تک

پروین طاہر کے نظمیہ مجموعہ نیلگوں کائی کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اس سے پہلے ان کی نظموں کے مجموعے تنکے کا باطن پڑھنے کا شرف بھی ملا۔ مجھے ان دونوں عنوانات میں ایک معنوی ربط دیکھ کر یک گونہ مسرت ہوئی کہ تخلیق کار کے درون میں کم مایہ کائناتی اشیاء کی طرف توجہ کا واضح رجحان ملتا ہے۔ تنکا سوکھا ہوا ہوتا ہے مگر نیل گوں کائی میں پانی کی آمیزش سے انکار ممکن نہیں۔ کائی تو پیدا ہی نم زدہ جگہوں پر ہوتی ہے۔ دھوپ سے محروم دیواروں پر، سیلن کی ماری کوٹھڑیوں میں۔ اور یہ بھی ایک ناقابلِ توجہ شے ہے۔ کتابوں کے ان ناموں سے ہمیں پروین طاہر کے درون میں عاجزانہ رویے کا اشارہ ملتا ہے۔ ان کے ہاں خود داری سے مملو عجز ہے، جو ان کی شخصیت کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے اور یہی عجز ان کی تمام شاعری کو بھی محیط ہے۔ کم مایہ اشیاء سے محبت بھی تو عجز کی ہی ایک مختلف شکل ہے اور یہ محبت پروین طاہر کی دونوں کتابوں کے عنوانات سے بخوبی عیاں ہے۔ دونوں کتابوں کے عنوانات کے معنوی ربط سے بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دوسری کتاب میں انہوں نے پچھلی کتاب کے تخلیقی وفور کا نقشِ ثانی بنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر جب ہم نیل گوں کائی کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں مضمون بندی اور خیال آرائی کے جہان با اندازِ دگر دکھائی دیتے ہیں۔ بہر کیف ہمیں نیل گوں کائی کے مفاہیم تک پہنچنے کے لیے اسی عنوان کی ایک نظم کی ترائیوں میں گھومنا ہوگا، جہاں ایک قدیمی خواب کا منظر جگمگاتا ہے / ترنم ایک جھرنے کا / سنائی دے رہا ہے / اک قدیمی خواب کا منظر / دکھائی دے

طالب انصاری

رہا ہے / سامنے جیسے کوئی / عہدِ عتیق
ہے / ندی، پربت، ہمالہ ہے /
ترائی میں وسیع اک / گھاس کا
میدان / اوپر چاند ہے / اور چاندنی
ہے / اسپ ہے اور شاہ زادہ / جس
کا چہرہ چاند سے / روشن زیادہ /
باگ کو تھامے ہوئے / لیکن ندی کے
دوسری جانب / یہاں پر اس طرف /
لا حاصلی کی نیل گوں / کائی جمی ہے
/ میں کہاں پر ہوں / کسی سپنے میں
ہوں / یا پھر تخیل کے بھنور میں گھومتی
ہوں / کچھ پتا چلتا نہیں مجھ کو

.....

اس نظم میں نیل گوں کائی ایک لا حاصل آرزو کا پتا دے رہی ہے۔ ہر عورت کوئی نہ کوئی سپنا بُنتی ہے۔ حسین سپنا۔ مگر ہر حسین سپنے کے مقدر میں چاند کہاں؟ بیشتر کا انجام یہی نیل گوں کائی ہوا کرتی ہے۔ پروین کا المیہ بھی یہی نیل گوں کائی ہے۔ ''میں ترنجن میں بیٹھی رہ گئی'' نظم کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہی المیہ ایک نیا احساس لیے نظر آتا ہے۔ حظ اٹھانے کے لیے اسی کرب پر مشتمل ایک اور نظم بعنوان میری ہستی میرا نیل کمل پڑھنا لازم ہے:

مرے خواب جزیرے کے اندر / اک
جھیل تھی نتھرے پانی کی / اس جھیل
کنارے پر سندر / اک نیل کمل جو کھلتا
تھا / اس نیل کمل کے پہلو میں /
اک جگنو جگ مگ جلتا تھا / دو چار
دنوں سے پھول کمل / کچھ زردی
مائل لگتا ہے / اور جگنو خواب جزیرے
کا / کچھ سہما سہما لگتا ہے / مری
ہستی، میرا نیل کمل / اور جگنو جوت
ہے سپنے کی / مرا خواب رہے تو میں
بھی ہوں / مری جوت جلے تو میں
بھی ہوں / ورنہ کیا لینا دینا ہے /
اس خالم خالی دنیا سے

.....

پروین طاہر نے لا حاصلی کے استعارے ایسی جمالیات کے ساتھ پیش کیے ہیں کہ یہ دھنک رنگ منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ زبان اور لفظیات بہت کومل ہیں۔ ان کی نظمیں گھن گرج اور جاہ و جلال کی دھمک سے ہٹ کر آہستہ خرامی سے آگے بڑھتی ہیں اور ہوا کے نرم مزاج جھونکے کی طرح سرشار کر جاتی ہیں۔

اب پروین طاہر کے درون میں عاجزانہ خودداری کا مطالعہ کرتے ہیں کہ یہ وصف بھی مجھے ان کے شعری و شخصی اسلوب میں غالب عنصر کے طور پر نظر آیا۔ اس وصف کی پرتیں سمجھنے کے لیے ان کی نظم

سہ رخی نسبت کا حوالہ مناسب رہے گا۔ یہ بنیادی طور پر نسب نامہ ہے۔ اسد اللہ خاں غالب نے بھی اپنا نسب نامہ بیان کیا تھا:

برسوں سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

.....

غالب کے نسب نامہ میں ایک خاص وضع کا فخر پایا جاتا ہے۔ پروین کے ہاں اس نوع کی خود پسندی نہیں ہے۔

اب پروین طاہر کی نظم ''سہ رخی نسبت'' پڑھیے:

زورِ بازو پہ سر کیے دریا / ان کو رغبت نہ تھی سفینے سے / ہر نوالہ حلال کا پایا / رزق ڈھونڈا زمیں کے سینے سے / ایسے کھلیان ان سے سجتے تھے / جیسے انگشتری نگینے سے / میرے آبا کی سہ رخی نسبت / خاک سے ، خون سے، پسینے سے

.....

پروین طاہر کو اس بات پر ایک عاجزانہ فخر ہے کہ ان کے آباء کا تعلق مٹی سے حلال رزق کمانے سے ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ لاشعوری سطح پر ان کے ہاں افتادگانِ خاک سے محبت کا جو رویہ جھلکتا ہے، وہ دہقانی ماحول اور اس کی باقیات کا ہی تسلسل ہو۔ بہر طور اس نظم میں غالب کی سی تعلّی نہیں ہے، مگر ایک ایسا فخر موجود ہے، جس کی جڑت محنت سے حاصل کیے گئے رزق سے وابستہ ہے۔ یہ نظم آہنگ اور قافیہ بندی کی خوب صورتی کے علاوہ معنوی سطح پر پروین طاہر کے باطن میں سہ ابعادی المیوں کی نشان دہی بھی کرتی ہے۔ خاک ہوتی ہوئی تمنائیں۔ خون میں نہلائے ہوئے خواب اور تھک ہار کر پسینہ پسینہ ہوتی آرزوئیں ، وہ المیاتی سطحیں ہیں۔ جو پروین طاہر کی نظموں کے متنی مواد میں کہیں بہت واضح اور کہیں بین السطور موجود ہیں۔ ان سہ ابعادی المیوں نے مل کر نتیجے کے عناصر کے طور پر جذباتی تنہائی اور لاحاصلی کے کرب کو جنم دیا ہے۔

مجھے پروین طاہر کے ہاں فکری سطح پر کوئی شعری نظریہ نظر نہیں آیا۔ یوں بھی شاعری ایک آزاد اور خود مختار ذہنی تفاعل ہے۔ یہ اپنا ماحول خود بناتی ہے۔ میری دانست میں شاعری سے وابستگی ہی پروین طاہر کا شعری عقیدہ ہے۔ ہمیں اسی عقیدے کو پیشِ نظر رکھ کر پروین طاہر کی شعری جہات کے سفر پر نکلنا چاہیے۔

نیل گوں کائی کا آغاز ایک نظم ''مرے جاگنے کا اشارہ'' سے ہوتا ہے۔ اس نظم کی تہہ دار معنویت میں حوصلہ مندی کا وہ مفہوم بھی پوشیدہ ہے، جو تخلیق کار کو پھر سے ایک نئے عزم سے ہم کنار کرتا ہے،

زندگی سے یاسیت کو نکال کر رجائیت بھر دیتا ہے۔ ٹوٹنے سے بچاتا ہے۔ مگر وہ کون ہے، جو نئے عزم سے آشنا کرتا ہے۔ کیا یہ جذباتی تنہائی کا شکار تخلیق کار کا اپنا وجود ہے۔

پروین طاہر کی نظم کی آخری سطریں ملاحظہ فرمائیے:

زمانے کے چکر کو ہاتھوں میں تھامے / مجھے ایک لاشہ سمجھ کر گزرتے رہے قافلے سب / کسی کو بھلا کیا پڑی تھی / کہ دو گھونٹ پانی کے / مجھ کو پلاتا، اٹھاتا، گلے سے لگاتا / اچانک ہی کچھ اشک میری / جبیں پر پڑے تو مجھے ہوش آیا / مجھے ہوش آیا / تو دیکھا اسے جو مجھے دیکھ کر / رو رہا تھا / مسلسل پکارے چلے جا رہا تھا / اٹھو اے بہادر مسافر اٹھو پھر سے جاگو / کہ منزل تمہاری تمہیں ڈھونڈتی ہے / بھلا کون تھا وہ / مرے تن بدن کا درخشاں ستارہ / جو ہے شرف انسان کا استعارہ / مرے جاگنے کا اشارہ

.....

پیش لفظ کے پہلے پیراگراف کو دھیان میں لا کر نظم ''مرے جاگنے کا اشارہ'' پڑھیں تو اس نظم کے عمق میں چھپی معنویت آشکار ہونے لگتی ہے۔ اسی بات کو باانداز دگر ''کرشمہ اک ندا کا'' میں بیان کیا گیا ہے مگر سوال یہ ہے کہ وہ کون ہے، جس نے تخلیق کار کو نئے سرے سے جینے کا عزم بخشا ہے۔ یہ تخلیق کار کی اپنی ذات ہے، اس کا دل ہے۔ اس کا اشارہ ہمیں ایک اور نظم ''مناجاتِ دل'' میں ملتا ہے۔ ''مناجات دل'' کی آخری سطریں پڑھنے سے یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے:

مرے دل، میرے مرشد / اے مرے دیرینہ ہم دم / اے سنہری عکس والے / نور میں ڈوبے کلس والے / کہاں ہو تم ؟ / مرے دل یاد ہے تم کو؟ / تمہی نے جنگلی جذبوں کی / انگلی تھام کر ہموار رستوں پر / سمجھ چلنا سکھایا تھا / کثافت سے لطافت کے سفر میں / تم مرے ہم راہ چلتے تھے / اگر میں ہانپ جاتی تو / تمہی پھر سے اٹھاتے / عزم نو کو باندھتے، ہمت دلاتے تھے / مقدر سے ملی تنہائیوں میں / کوئی بھی اپنا نہیں ہوتا مگر تم تھے! / زمانے کی انوکھی بھیڑ میں / ادراک ہجوم بے پنہ میں / راستا آساں نہیں ہوتا / مگر تم نے بنایا! / دل مرے میں نے تمہارا در / کبھی جو کھٹکھٹایا / تو تمہیں موجود پایا / اے مرے دل، میرے مرشد / پھر تمہیں میں نے بلایا ہے / کسی ہونی نے منہ کے بل گرایا ہے ------

نفسیات دان کہتے ہیں کہ شدید دکھ یا تو کسی تخلیق کار کی تخلیقی قوتوں کو صیقل کر دیتے ہیں یا اس سے تخلیقی توانائی کچھ وقت کے لیے چھین لیتے ہیں۔ زندگی کے ہم وار رستے پر چلتے چلتے ایک ایسا موڑ بھی آیا کہ پروین طاہر کے ساتھ موخر الذکر معاملہ ہو گیا اور کسی ہونی نے انہیں منہ کے بل گرا دیا۔

ہر انسان کو زندگی میں کچھ ایسے حادثات سے سابقہ پڑتا ہے، جو نہ بھرنے والا زخم دے جاتے ہیں۔ اس زخم کی ٹیسیں انسان کی ہر سانس میں بس جاتی ہیں۔ پروین طاہر صاحبہ کو بھی 2009 میں ایک ایسے حادثے سے دوچار ہونا پڑا، جو انھیں زندگی بھر کا روگ دے گیا۔ ہر صاحب اولاد جانتا ہے کہ اولاد کا دکھ کیسا جاں گسل ہوتا ہے۔ پروین طاہر کو بیٹے کی موت کا صدمہ سہنا پڑا۔ فکری سطح پر جذباتی تنہائی تو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس سانحے نے انھیں مزید تنہائی کا شکار کر دیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے بیٹے کی موت کے تناظر میں لکھی ہوئی ایک نظم ''دست بردوش'' پڑھتے ہیں۔ نظم کیا ہے۔ گویا سطر در سطر دریائے گریہ ہے، جو الفاظ کے پرنالوں سے امڈتا دکھائی پڑتا ہے اور نظم کا عنوان دست بردوش، تسلی کے معانی کا بہت عمدہ اشارہ ہے:

مری ماں / تجھے کیوں شبہ ہے / کہ
میں اب نہیں ہوں / جہاں بھی رہوں /
میں یہاں ہوں، یہیں ہوں! / ذرا دور
باغ عدم میں گیا ہوں / ''ہمیشہ'' کی
اک شاخ پر کھل گیا ہوں / مری ناف
سے تیرے آنول کا بندھن / ابھی تک
بندھا ہے / یہ جب تک بندھا ہے /
میں تیرا رہوں گا، میں پل بھر کو بچھڑا ہوں
/ پھر سے ملوں گا / ازل سے ہوں تیرا،
ابد تک رہوں گا / تری سیڑھیوں،
کمروں، دیواروں ،گملوں میں کھلتے
گلابوں میں / ہنستا رہوں گا / ترے
دل میں بستا رہوں گا / مری ماں / یہ
بہنیں مری لاڈلی ہیں / یہ دکھ کے سمندر
میں ڈوبی ہوئی ہیں / فقط تو ہی امید کا
اک سفینہ / اسے آنسوؤں میں ڈبوتے
نہیں ہیں / یوں روتے نہیں ہیں

.....

کیا مذکورہ نظم ایسی ہے، جس سے سرسری گزرا جائے۔ اس نظم میں گندھے دکھ کی بوچھاڑ میں خود کو نہ بھگویا جائے۔ اس نظم میں پروین طاہر کی ممتا کی تنہائی کو دریافت نہ کیا جائے۔ بل کہ دریافت تو اس شے کو کیا جاتا ہے، جو چھپی ہوئی ہو۔ یہاں تو یہ تنہائی آگے بڑھ بڑھ کر گلے ملتی ہے۔

مذکورہ حادثے کے بعد ایک طویل عرصہ

پروین طاہر نے شعری دنیا سے بالکل الگ تھلگ گم سم کیفیت میں گزارا۔ مگر جب جاگنے کا اشارہ ملا تو ایسی شان دار نظمیں تخلیق کیں، جن سے نہ صرف ان کی طویل شعری ریاضت جھلکتی ہے، بل کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعری دنیا سے کنارہ کش ہوتے ہوئے بھی یہیں کہیں تھیں اور جدید نظم کے تہذیبی اور عصری نقوش سے جڑی ہوئی تھیں۔

جیسا کہ میں نے اپنے مضمون کی بنیاد اس بات پر اٹھائی ہے کہ پروین کی نظموں میں جذباتی تنہائی اور لاحاصلی کی کرب ناکیاں غالب رجحان کے طور پر موجود ہیں۔ یہ تنہائی اور لاحاصلی ہر حیثیت میں شدید المیاتی احساس سے گھری ہے۔ پروین کے ہاں جذباتی تنہائی اور لاحاصلی غالب عناصر کے طور پر اس کی نظموں میں کہیں بین السطور اور کہیں بہت واضح انداز میں موجود ہیں۔ اپنی جذباتی تنہائی کو انہوں نے پیش لفظ میں سیتا کے چودہ سالہ بن باس سے جوڑا ہے۔ سیتا کی تنہائی کا تعلق بستی سے لاتعلق ہو کر بن میں بسرام کرنے سے ہے مگر جب انسان شہر میں رہتے ہوئے، بہت سے لوگوں میں گھرا ہونے کے باوجود خود کو اکیلا محسوس کرے تو یہ جذباتی و ذہنی تنہائی چودہ سال کے بن باس سے زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ جذباتی تنہائی کے اس جان لیوا احساس نے پروین طاہر سے باکمال نظمیں تخلیق کروائی ہیں۔ وہ اپنے ہونے کی بے یقینی اور نہ ہونے کے یقین کے درمیان ڈولتی زندگی کی ناؤ کو کھیتی ہے۔

خموشی تو ہی اتم ہے، کتاب صفر، تری اک نظر کے نیاز میں، بکھراؤ، فاختہ گاتی نہیں ہے، کیا روگ لگا ہوتا ہے، نقطہ ہے ایک سچائی، نادیدہ نم ایسی نظمیں ہیں جو پروین طاہر کے ہاں موجود ایک جہت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ وہ جہت جو میں نے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے محسوسات کے کما حقہٗ اظہار کے لیے پروین طاہر نے ان ہندی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے، جو ادبی دنیا کے لوگوں کے لیے غیر مانوس تو نہیں ہیں، مگر متواتر استعمال میں نہیں ہیں۔ انہی کومل الفاظ کے برتاؤ نے ان کی نظموں کو دھنک رنگ بنایا ہے۔ میں برتے گئے چند ہندی الفاظ درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اُتّم، رشی، نرمل، اسارنا، پالن کرنا، امر سگندھ، بیراگن، پھلکاری، جوت، نیل کمل، پون، چمپاوتی، بھید بھاؤ، ترنجن، وردان، حج گامنی، پنہاری، راجدھانی، کل یگ، نرتکی، مالا، پدماوتی، پریم، کن رس، دان کرنا، جوتی، گاگر، کامنی، جوگ، ہریل ساونی، بگیری، ارپن کرنا، مدھرا، ست یگی، بھیتر، تپسیا، نوکا،

دیالو، مہانتا، سنیہہ، چھپ، تانڈھ، مرن سگند، بان، راگ ایمن، کومل، یوگ آسن، دھونی رمائے، اشلوک، کرو کھیشتر کا میدان وغیرہ۔

پروین طاہر کی نظموں کی یوں تو کئی معنوی سمتیں ہیں، میں نے اپنی دانست میں ایک واضح جہت دریافت کی ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ پروین طاہر نے تنکے کا باطن سے لے کر نیلگوں کائی تک جو نظمیں پیش کی ہیں، وہ ان میں اپنا آپ منوانے میں کام یاب ہو گئی ہیں۔

پروین طاہر کا شمار راول پنڈی / اسلام آباد کے ان نظم نگاروں میں ہوتا ہے، جن کی وجہ سے اسلام آباد کو شہرِ نظم کہا جانے لگا ہے۔ راول پنڈی / اسلام آباد میں آفتاب اقبال شمیم سے لے کر احمد شمیم، انوار فطرت، ڈاکٹر وحید احمد، روش ندیم، شہزاد اظہر، ارشد معراج، علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر اور رفیق سندیلوی تک ہوتی ہوئی نظم کئی اسلوب کے ذائقے چکھ چکی ہے۔ پروین طاہر نے انھی معاصر نظم نگاروں میں ایک نمایاں پہچان بنائی ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات کو سامنے رکھیں تو پتا چلتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے ایک ایک زاویے کا مشاہدہ اس کے لمحے لمحے میں اتر کر کیا ہے۔ مشاہدے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے فہم وادراک کو فکری اور فنی پختگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظموں کے متنوع موضوعات اور متنی مواد کے تنوع کو دھیان میں رکھیں تو یہ کہنے میں کوئی اڑچن نہیں رہے گی کہ ہمیں ان کے ہاں نئے نئے امکانات کے آفاق روشن دکھائی دیتے ہیں۔ اوراق تحسین سمیٹنے سے پہلے ایک نظم ''فقط ہے ایک سچائی'' جو پروین طاہر کی شاعری میں میری دریافت کردہ جہت کی عکاس ہے، درج کر کے تمت بالخیر کہتا ہوں:

نیم نیلی نیند کو اوڑھے ہوئے / وہ چاند آدھا / غم زدہ، رنجور دھیرے سے / مرے پہلو میں آتا ہے / مرے کاندھے پہ سر رکھ کر / بہت آنسو بہاتا ہے، رلاتا ہے / اچانک چاندنی کو ایڑھ دے کر / پھر خلا میں لوٹ جاتا ہے / نظر آتا نہیں اس کو؟ / مرے سینے کا خالی پن / خلا جو جسم کے پاتال سے اٹھے / تو روحوں کی افق، آفاق تک / پھیلے چلا جائے / بھلا وہ اک خلا سے دوسرے تک / اپنے آنسو رولنے کو / دائمی دکھ پھولنے کو / کس لیے نیچے چلا آئے / یقیناً جانتا ہوگا / مکاں کے اس سرے سے / اس سرے تک / پھیلتی شب رُو / فقط ہے ایک سچائی / یہ تنہائی !!

☆☆☆☆☆

نیلی آنچ کی تخلیقی لَو سے نکلتی شعری تپش

پہلے تو محترمہ نیلم ملک کا شکریہ کہ انھوں نے بطور خاص اپنا پہلا شعری مجموعہ زمانۂ کرونا کے اختتامی ایام میں عنایت فرمایا۔ ساتھ ہی معذرت کہ پے در پے معاملاتِ دنیا کو نمٹانے کی سعی کے باعث مفصل رسید پیش کرنے میں کوتاہی ہوتی رہی۔ اسی اثنا میں شاہدہ مجید صاحبہ نے بہت محنت اور مہارت سے اس مجموعے سے ترانوے اشعار کا انتخاب بمعہ تبصراتی نوٹ کے ایک شاندار تحریر کی شکل میں پیش بھی کر دیا۔

گو کہ شہزاد نیّر اور حسین مجروح صاحبان نے کتاب کی ابتدا میں گرانقدر تقریظات سے پہلے ہی اسے مزیّن کر دیا ہے، لیکن پورا مجموعہ پڑھنے کے بعد قلم گویا عالمِ وارفتگی میں کچھ نہ کچھ لکھنے پر مائل ہوتا گیا، سو لازم ہوا کہ قلم کی اقتدا خاموشی سے کی جائے۔

''نیلی آنچ'' خوب صورت، نفیس اور مشاقی سے کہی گئی غزلوں پر مشتمل بہت مناسب حجم کا مجموعہ ہے جس کا ورق ورق شاعرہ کی گہری مشاہداتی قوت، تخیلاتی رفعت اور پختگیِ اظہار کے حق میں قوی شہادت دیتا نظر آتا ہے۔

اردو ادب میں قراۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، خدیجہ مستور اور حجاب امتیاز سمیت کئی نثّار خواتین کے اسما گزشتہ صدی کے نثری گوشے کو منور کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ادا جعفری کے زمانے سے لے کر پروین شاکر تک کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور دیگر معاصر شاعرات کے علاوہ جدید ترین شعری افق پر حمیدہ شاہین اور عنبرین صلاح الدین جیسے بڑے ناموں کی فہرست نسبتاً کم طویل ہے۔ شاید مرد۔ غالب معاشرتی فضا اس کا سبب ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ باپ کے مقابلے میں ماں کی ذمہ داری بہت شدید اور نازک ہوتی ہے۔ اگر اس مفروضے کو درست مانا جائے تو لامحالہ دھیان اس طرف جاتا ہے کہ پھر تو اصولاً بیشتر شاعرات کا شہکار کلام ان کی ازدواجی زندگی سے قبل تخلیق و تشکیل کے مراحل سے گزر کر منظرِ عام پر آئے لیکن یقیناً ایسا نہیں ہے۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ برِصغیر کی خواتین کی روایتی شرم و حیا نے بیشتر خلّاق اذہان کو تذبذب میں رکھا ہوگا جس کے باعث ایک بڑی اکثریت مضبوط تخلیقی صلاحیتوں کے باوصف اپنے تخیلاتی خزینے کا رشتہ اظہار سے براستۂ سخن انسلاک نہ کر پائی۔ میرے محدود مشاہدے پر مبنی اس قیاس کو تقویت یوں ملتی ہے کہ کچھ خال خال شاعرات کے لاشعور میں اس تذبذب کا لاوا پکتے پکتے باغیانہ رنگ میں پھوٹا اور ''بدن دریدہ'' قبیل کے مجموعے ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن قبولیتِ عامہ کی بڑی سند ان کے حصے میں نہ آ سکی۔ نیلم ملک نے اس دور میں سفرِ سخن شروع کیا جب

افتخار الحق

دور برقیاتی مواصلات کو شروع ہوئے لگ بھگ پانچ دس سال ہو چکے تھے۔ الفاظ کا برقی لہروں پر سفر کوئی معمولی بات نہ تھی کہ اس نے فرد سے لے کر معاشرے اور رفتہ رفتہ پورے عالمی گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایسے میں شعرا و شاعرات کی وہ نوع تشکیل ہونے لگی جسے اپنے ماحول کا ادراک بہت تیزی سے ہوا اور ساتھ ساتھ شعور نے ایک نئی انگڑائی لیتے ہوئے سمجھایا کہ روایتی تشبیہ و استعارے کا زمانہ لد گیا۔ شاعری میں لگی بندھی صنعتوں سے بھی کام نہیں چلے گا۔ ایسے میں راست بیانیے کا انداز نثر و نظم کی کم و بیش تمام اصناف پر اپنی چھاپ لگانے لگا۔ لطف کی بات یہ کہ بالواسطہ اظہاری طرز کی آڑ میں یہ سہولت میسر ہونے لگی کہ ''کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے'' کی فضا پروان چڑھنے لگی سو شاعرات نے اس نئی ثقافتی فضا سے شعوری و لاشعوری سطح سے خوب فائدہ اٹھایا اور نیلم ملک کے قلم نے ایسے اشعار لکھے:

تبھی وہ سمجھے کہ ہم کھلونے نہیں ہیں جب ہم
وہاں سے ان کو ملے جہاں پر دھرے نہیں تھے

.....

یہ کیسے جادو نگر میں ہم آ گئے ہیں جہاں
جو ہم نہیں وہ بنا کر دکھائے جاتے ہیں

.....

پہلو بدل بدل کے مفاہیم کھوجنا
ابہام لے کے پہلو میں سوئے ہیں شعر کیا

.....

آج کچھ ایسی جی میں بات سمائی ہے
پہلے کہہ دوں بعد میں اس کو تولوں میں

.....

ان اشعار میں جدید غزل کے کم و بیش تمام رنگ موجود ہیں لیکن سب سے چوکھا رنگ یہ ہے کہ بڑے سے بڑا نقاد متن میں یا بین السطور متن کے دروازے پر بار بار دستک دے کر بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ شعر کسی شاعر کے ہیں یا شاعرہ کے۔ جب ہم جدید غزل کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو یہ سوال اٹھنا لازم ہے کہ اس کی تعریف کیا ہے یا ایسی غزل کی کونسی جہات اسے اپنی پیش رو سے ممتاز کرتی ہیں۔ جواب کسی بھی صورت اختصار کے دائرے میں نہیں سما سکتا گو کہ کسی حد تک جامعیت کے حصار سے کچھ جھانک کر معاملہ نمٹایا جا سکتا ہے۔

صاحبو! راقم کے نزدیک جدید غزل/شاعری کی ایک بڑی پہچان وہ آفاقی رنگ ہے جو کلاسیکی دور کے اسلوب و آہنگ سے پہلی نظر میں ہی جداگانہ دکھائی دے، جس میں استعارہ براہ راست نہ برتا گیا ہو بل کہ کچھ اس طور کلام میں لایا گیا ہو کہ علامت کی سرحد پر مکمل اعتماد سے ایسے کھڑا ہو کہ پلٹ کر استعاری منطقے میں جھانکتے ہوئے اپنے قدم علامت کی سلطنت میں رکھنے پر قادر ہو۔ ایسا کلام، خاص طور پر غزل کہنے کیلئے ایک خاص تربیت درکار ہے جو شاعر خود اپنے آپ کو دینے پر قادر ہوتا ہے۔ اپنے درون میں ایک ایسا ہمزاد تشکیل دینا پڑتا ہے جو بیرون میں کسی اور روپ میں ظاہر ہو۔ ایسا تبھی ممکن ہے جب شاعری کو کُل وقتی انداز میں اپنایا جائے۔ کچھ اشعار اس ضمن میں دیکھیے:

میں ایک ناظر وہ اک مصور
کئی مناظر دکھا رہا ہے

.....

ابھی جن دائروں میں مصلحت نے نطق جکڑے ہیں
اُلجھ کر ان میں اک دن خود ہی یہ پرکار بولے گی

.....

اگلے در پر جا بیٹھوں تو پچھلا در کھل جاتا ہے
لوٹ کے گھر جانا چاہوں تو رختِ سفر کھل جاتا ہے
باہر سے جب کھولتے ہیں تو کھلتا ہے بس دروازہ
اندر سے کھل جائے اگر تو سارا گھر کھل جاتا ہے
ہم جس خواب کے سحر میں اپنی ساری رات گنواتے ہیں
دن میں اس کو چھو لیتے ہیں اور اثر کھل جاتا ہے

.....

یہ میرے اندروں اب انقلاب آنے لگا ہے
کہ باہر ہی کے سب تبدیل منظر ہو گئے ہیں

.....

نامعلوم کی کھوج میں اک دن نکلے تھے
تب سے نامعلوم رہے ہیں ہم دونوں

.....

ایسے فکری رفعت سے لبریز اشعار پڑھ کر حیرت مکرر قرات کا تقاضا کرتی ہے اور سوال بھی اٹھاتی ہے کہ اکیسویں صدی کی شاعرہ کو ایسی قادرالکلامی کیوں کر حاصل ہوئی ہوگی۔ لازماً کثرتِ مطالعہ بنیادی عنصر ہوتا ہے اور مطالعہ بھی محض لذتِ فکر کی حد تک نہیں بلکہ اسے تحریک کی صورت ایک مشن بنا دیا جائے تو احساس کے سیلاب کو راستے ملتے چلے جاتے ہیں۔

چلتے چلتے نیلم ملک کی شاعری کے اس پہلو پر بات ہو جائے جسے دیکھ کر پتا چل جاتا ہے کہ شاعرہ کا کلام ہے، یعنی جہاں دانستہ انھوں نے تانیثی لہجہ اپنایا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس پہلو کا حامی اس لیے ہوں کہ اپنی مضبوط شناخت کے لیے شاعرہ کا جبلی حق ہے کہ وہ نسائی انداز بھی اپنائے تاکہ نسائیت کی تحریک کے جس مرحلے سے دنیا گزر رہی ہے، اس کی مزید توجیہہ کا سامان ہو سکے۔ کچھ شعر دیکھیے اور سر دھنیے:

تتلیوں سے دست بستہ التماس
فاصلہ رکھیے مرے گلفام سے

.....

میں پھر تری خیرات کے کاسے میں ڈال لوں یہ نہیں گوارا
کہ تیرے در سے اٹھی تو جو زندگی ملی ہے بہت بھلی ہے

.....

میں سمندر بنا سکی نہ تجھے
آخرش جھیل کر لیا خود کو

.....

اوّل اوّل خود بنیاد میں ہوتی ہوں پوری
جب تعمیر کروں تُو بنتا ہے

.....

یہ ہے نیلم ملک کا وہ رنگ اور اسلوب جو ان کی مخصوص شناخت کو مزید اجاگر کرے گا۔ خلش اور اس سے بُنی ہوئی تشنگی ایک خود کار میکانکی انداز میں جس سپردگی پر منتج ہوتے ہیں وہ تو اس کلام میں وافر دستیاب ہے لیکن عورت جب پیراہنِ عشق میں ملبوس ہو کر مستی و بے خودی سے لبریز بھی ہو اور اپنی انا اور خود اعتمادی کے اثاثہ جات بھی سنبھالنے پر مُصر ہو ایسے اشعار کا ورود سہولت اور کثرت سے ہونا منطقی بھی ہے اور فطری بھی۔ نیلم ملک جدید اردو سخنوری کے افق پر کافی نمایاں قوسِ قزح بنانے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں اور امید ہے وہ اپنے انفرادی رنگ سے اس افق پر اپنے گہرے رنگ کی چھاپ سے اپنا مقام خوب بنائیں گی اور منوائیں گی۔

☆☆☆☆☆

کہانی ایک شہر کی

عرفان صادق

ہم دم دیرینہ خوب صورت سوچوں کے مالک خوب صورت شاعر ڈاکٹر جواز جعفری کا تازہ شعری مجموعہ ''کہانی ایک شہر کی'' ایک طلسم کدہ ہے ایک حیرت سرا ہے یہ مجموعہ ایک ایسے طلسماتی شہر کی کہانی سناتا ہے جس کی آب وہوا میں ایک تحیر ہے ایک جادو ہے اس کی ہواؤں میں ایسی اپنائیت ہے کہ اجنبی کو اجنبیت محسوس نہیں ہونے دیتیں۔ یہ مجموعہ شہر لاہور کی کہانی سناتا ہے۔

میرے لیے اس طلسماتی شہر اور جواز بھائی کی باتیں ایک ساتھ وا ہوئیں۔ یہ نوے کی دہائی کے ابتدائی سالوں کی بات ہے جب میں بی اے کرنے کے بعد لاہور آیا ادبی حلقوں میں جس پہلے بندے سے میری شناسائی ہوئی جس نے صحیح معنوں میں مجھے اور میری شاعری کو سراہا عزت دی وہ جواز بھائی ہیں۔

ڈاکٹر جواز جعفری کی شعری کائنات کو سمجھنے کے لیے کم وبیش چھ ہزار سال قبل مسیح میں انسانوں نے جو ریاستیں بنائیں ان ریاستوں کے زیر اثر جو شہر آباد کیے ان شہروں میں لوگ کس طرح اپنی زندگیاں گزارتے تھے ان کا مطالعہ بہت ضروری ہے ان کی کیسی معاشرت تھی ان کو سمجھے بغیر جواز جعفری کی شاعری کو سمجھنا بہت مشکل ہے چاہے ان کی کتاب خوابوں سے بھری گلیاں ہو یہ زیر نظر کتاب کہانی ایک شہر کی

یہ اپنی شاعری کی بنیادیں انہیں اساطیری سرچشموں پہ اٹھاتے ہیں جو اس وقت ریاست سُومیر کے زیر اثر بسائے گئے شہروں میں بہتے تھیان میں میٹھے پانی کے دیوتا ان کی کی ملکیت اریدو شہر کا آپ کو ذکر ملے گا۔ اس وقت کے سب سے بڑے دیوتا انو کی ملکیت شہر اریک کا ذکر ملے گا۔ ہوا کے دیوتا ان لیل کے زیر اثر آباد ہونے والے شہر نیفر کا ذکر ملے گا۔ چاند دیوتا نَنا کے زیر تسلط اُر شہر سے متعلق معلومات ملیں گی۔

عکاد کے سب سے بڑے شہر بابل کا بار بار تذکرہ ملے گا۔ اُسور کے اہم ترین شہر نینوا اور نمرود کے متعلق تلمیحاتی آہنگ میں کہی ہوئی شاعری ملے گی۔ یہی فضا ان کی پوری شاعری میں موجود ہے۔

ڈاکٹر جواز جعفری کا زیر نظر شعری مجموعہ کہانی ایک شہر کی دو طویل نظموں کہانی ایک شہر کی، سرگزشت اور کچھ مختصر نظموں پر مشتمل ہے۔

پہلی نظم ایک شہر کی کہانی

لاہور شہر کی کہانی ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے ہزاروں سال ماضی کی طرف سفر کر کے عہد موجود تک اس شہر میں ہونے والی تبدیلیوں اور ظلم و ستم کو تاریخی اعتبار سے شاعرانہ پیرائے میں بڑے ہی خوش کن انداز میں نثری نظم کا چولا پہنا دیا ہے۔ اس سے ایک طرف ہمیں ڈاکٹر صاحب کی تاریخ سے گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف نثری نظم کی بنت اور لفظیات کے برمحل استعمال پر ان کی دسترس اور مہارت کا ادراک ہوتا ہے۔ یہ نظم پڑھتے ہوئے مجھے بار بار یہ احساس ہوتا رہا کہ نثری نظمیں لکھنے کا استحقاق صرف جواز جعفری جیسے شعرا کو ہی حاصل ہونا چاہیے جنھوں نے اردو غزل میں اپنے آپ کو منوایا اور کئی نہایت اعلیٰ پائے کے غزلیہ مجموعوں سے اردو شاعری کو ثروت مند کیا۔

میرے خیال میں نثری نظم لکھنا پابند نظم لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ کیونکہ یہ محض نثر لکھنا نہیں ہوتا بل کہ نثر کو شاعری بنانا ہوتا ہے، جس دور میں غزلوں اور نظموں میں شاعری کم کم بل کہ نہ ہونے کے برابر ہو اس دور میں شاعری سے لبریز نثری نظمیں پڑھنا کسی نعمت سے کم نہیں۔ ممتاز شاعر غلام حسین ساجد نے کتاب کے فلیپ پہ یہ جو لکھا ہے کہ ڈاکٹر جواز جعفری کی صورت میں نثری نظم کو اس کا صحیح وارث مل گیا ہے تو ان کی بات سو فی صد درست ہے۔

ڈاکٹر جواز جعفری کی نظموں میں اس شہر کی صدیوں پرانی تاریخ دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جب ہم پرانی تہذیبوں کی بات کرتے ہیں پرانے زمانوں کا تذکرہ کرتے ہیں اس زمانے سے جڑے ہوئے الات حرب تلوار تیر کمان نیزہ جیسے الفاظ کا ہماری گفتگو میں بکثرت استعمال ہوتا ہے ظاہر ہے یہ اس دور کی ضرورت اور کلچر کا حصہ تھا۔ ان جنگی آلات کا ذکر جواز جعفری کی نظموں میں بھی کثرت سے ملتا ہے لیکن ان اوزاروں سے جڑی

سفاکیت ان کی نظموں میں آ کے ریشمی غلاف پہن لیتی ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے یہ کہانی سنانے والا نرم خو نرم مزاج اور درد دل رکھنے والا ایک شاعر ہے:

خون کی بارش میں
میں نے امید اور مزاحمت کے گیت لکھے
اور شہر کے دروازے اجنبیوں کے لیے کھول دیے
ہر بار میں نے دھوپ کا انکار کیا
اور سایہ دار پیڑوں میں جڑ پکڑ لی
سورج سوا نیزے پہ آیا
تو پیاسی زبانیں ناف سے آ لگیں
مگر میں نے دریا سے پانی کی التجا نہ کی
میں نے جسم پر ست رنگے پر پہنے
اور شہر کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا

.....

جواز جعفری نے اپنی نظموں میں جو فضا بنائی ہے جو ماحول پیدا کیا ہے وہ سراسر ان کا اپنا ہے وہ ایک خاص کیفیت میں سطریں لکھتے چلے جاتے ہیں اور وہی کیفیت پڑھتے ہوئے قاری پر طاری ہوتی جاتی ہے:

میں نے شہر کے نواح میں
مہلک ہتھیاروں کے انبار دیکھے
جن کے گرد طواف کرتی آنکھوں سے حرف تحسین ٹپکتا تھا
میں نے صدیوں پرانے مہا بیانیے پہ شک کی نظر کی
رزم گاہ کے کنارے زیتون کے بیج بوئے
اور سرخ گلاب کی شاخ تھامے
لکیر کی دوسری جانب جا کھڑا ہوا
میرے گلاب زخموں سے الگ مہکنے لگے

.....

اس نظم کو تاریخ، ثقافت، تہذیب، رومان اور مذہب کے حسین امتزاج سے بنا گیا ہے۔ جس میں یہ سب عوامل پس منظر میں رہ کر کہانی کو آگے بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں اور منظر عام پر نظمیہ آہنگ میں گندھی ایسی شاعری لاتے ہیں جو پڑھنے والوں کو سرشار کر رہی ہے

اگر چہ ایک شہر کی کہانی ایک نوحہ ہے ایک ایسے شہر کا جسے مختلف علاقوں سے آنے والوں حملہ آوروں نے اپنے گھوڑوں کے سموں تلے تاراج کیا۔ وہ سلطان محمود غزنوی ہو شہاب الدین غوری ہو خاندان غلاماں، خلجی، تغلق، سید، لودھی، مغلیہ، ہو۔ نادر شاہ، احمد شاہ۔ رنجیت سنگھ یا برطانوی سامراج ہو سبھی نے اس شہر کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہے۔ جس کا اظہار ہمیں اس نظم میں ملتا ہے۔ لیکن جہاں شاعر اپنی محبت کے الوہی جذبات کا اظہار کرتا ہے نظم کے ان حصوں کی چمک دمک ہی الگ ہے۔ وہ چاہے وصال کے لمحوں کا ذکر ہو یا جدائی اور ہجر کی کیفیات کا بیان ہو:

میں نے اس سنہرے جسم کی کمان کو پہلو میں رکھا
وہ نیلی آنکھیں
مجھے کلام کا ہنر تعلیم کرنے لگیں
میرے چاروں طرف پھیلا اژدہام ایک
طرف ہٹ گیا
میں نے لوگوں کو رقص پہنتے دیکھ کر

اپنے گیت کی لے تیز کر دی
اور ایک ہی وقت میں
ہزاروں سینوں میں دھڑکنے لگا
میرے سامنے اس عورت کا سینہ
اجنبی جہاز کی طرح پھیلا تھا
مسافر جہاں اپنا دل بھول جاتے ہیں

.....

اس کتاب میں موجود دوسری طویل نظم سرگزشت چھ حصوں پر مشتمل ہے جو پہلے انسان کی کرہ عرض پر موجودگی سے لے کر عصر حاضر تک زمانی ترتیب کو ہمارے سامنے لاتی ہے اس نظم میں موجود زیلی نظمیں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوع علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وابستہ واقعات کو شاعر نے اپنے شعور کا حصہ بناتے ہوئے اور ان کا لمحہ موجود سے ارتباط کرتے ہوئے کمال ہنرمندی سے نظم کیا ہے۔

امتناع کے پیڑ کا پھل حضرت آدم علیہ لاسلام اور ماں حوا کا قصہ ہے جو ہمیں قرآن مجید میں ملتا ہے۔ جواز جعفری نے شعور کی رو میں غوطہ زن ہو کے دلکش استعارت سے نظم کو بُنا ہے۔

تند ہواؤں نے میرے سنگ میل ریزہ ریزہ کر دیئے
تو میں نے اس سرسبز عورت کی یاد میں گریہ ایجاد کیا
میں نے اس ہجر نصیب عورت کی یاد میں
زمین کے بچاروں اور باغ لگائے
اور ان کی روشوں پہ قدم آرائی کرنے لگا
میں نے اپنے لیے خیمہ دعا اور
بانسری ایجاد کی
اور اپنا غم بانسری کے سروں میں انڈیل دیا

.....

نظم کا دوسرا حصہ طوفان نوح سے جڑی جزیات کو بڑی عرق ریزی اور شاعرانہ سبھاو سے مزین کر کے ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ اساطری اور طلسماتی رچاو میں گندھی یہ نظم پڑھنے والوں پر حیرت اور لطافت کے کئی در وا کرتی ہے:

میری بستی کے گنہگاروں نے
دیوتاؤں کے دلوں کو ملول کیا
اور ان کے سوئے غضب کو آواز دی
میں نے ناراض دیوتاؤں کی خموشی کی سماعت کی
اور ساگوان کی لکڑی سے کشتی ایجاد کرنے گا

اسی نظم میں آگے چل کر کہتے ہیں۔

میں نے چالیس سال تک سرکش پانیوں کا چلہ کاٹا
دنیا میرے تلوؤں کے نیچے پڑی آنسو بہاتی رہی
میں نے دیوتاؤں کے ہر شکوہ دربار کے لیے
کبوتر کو اپنا سفیر نامزد کیا اور اسے کھڑکی سے
باہر اچھال دیا۔

باقی نظموں کا اظہاریہ بھی قرانی قصوں سے لیے گئے واقعات پہ ترتیب دیا گیا ہے جو ڈاکٹر جواز جعفری کے شعری نظام میں ڈھل کر کے بڑی شان اور وقار کے ساتھ اردو نظم کا کینوس وسیع کرتا ہوا ہماری سوچوں کو منور کر رہا ہے۔

میں ڈاکٹر جواز صاحب کو اس خوب صورت شعری مجموعے کی اشاعت پر دلی طور ہر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

کیا سناؤں میں سفرنامہ تجھے ـــــ ڈاکٹر یونس خیال کا خوبصورت سفرنامہ

قدرت جب کسی کو تخلیقی جواہر سے مرصع کرتی ہے تو اس کو کامل تخلیق کار کے درجہ پر فائز کرتی ہے۔ اس کا ہر کام اور ہر انداز نئے امکانات، نئے راستوں اور نئے زاویوں سے مزین ہوتا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں وہ کسی بھی صنف کا انتخاب کرے اس کی صلاحیتیں قابل رشک اور قابل دید ہوتی ہیں بالکل اسی طرح ڈاکٹر یونس خیال بھی ایک حقیقی اور جینوئن تخلیق کار ہیں جن کو قدرت نے بہترین تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال کر کے بھیجا ہے انھوں نے جو بھی لکھا اور جس صنف میں بھی لکھا باکمال، بے مثال اور لاجواب لکھا۔ ان کی شاعری دیکھیں تو ان کا ایک ایک شعر دل کے نہاں خانوں میں صرف جھانکتا ہی نہیں بل کہ اُترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تحقیق و تنقید کی طرف آئے تو ایسے ایسے نقاط اُٹھائے کہ بڑے بڑے صاحبان ادب کو ان کی تنقیدی بصیرت کا معترف ہونا پڑا اور سفرنامہ لکھا ہے تو قاری پر ان کی قلم کی روانی، سلاست اور شائستگی و شگفتگی کے کئی در وا ہوئے ہیں۔ اتنی خوب صورتی سے احوال قلمبند کیے ہیں کہ جیسے ہم اس سفر میں ان کے ہمرکاب ہیں۔ دل سے دل کی باتیں لکھی ہیں۔ بے لوث محبتوں اور شاندار رفاقتوں کے احوال دلوں کے تار چھیڑ رہے ہیں۔

سفرنامہ ایسی صنف ادب ہے جس میں سفرنامہ نگار دیارِ غیر میں پیش آنے والے حالات و واقعات، مشاہدات اور تجربات

فیصل زمان چشتی

سے قاری کو اس طرح آگاہ کرتا ہے، اتنی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے اور اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ قاری کے اندر بھی وہاں پر جانے اور دیکھنے کا جذبہ بیدار ہو جاتا تھے۔ سفر نامہ نگار داستانوی انداز بھی اپناتا ہے، منظر کشی کرتا ہے اپنی کہانی، لوگوں کی کہانیاں اور واقعات اس طرح مزے لے لے کر پیش کرتا ہے کہ قاری کا انہماک اور دلچسپی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بالکل اسی طرح ڈاکٹر یونس خیال نے بھی برطانیہ میں اپنے بیتے بیس دنوں کے احوال اور واقعات کی تفصیل اتنی خوب صورتی اور شگفتگی کے ساتھ لکھی ہے کہ اس کو شروع کر لیں تو ختم کے بغیر دل نہیں چاہتا۔ جزیات نگاری اور منظر نگاری میں انھوں نے کمال کر دیا ہے۔ تاثرات اور جذبات اس طرح لکھے ہیں لگتا ہے کہ ٹی۔ وی کی سکرین چل رہی ہے۔ پورے سفر نامے میں انھوں نے قاری کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں رکھا ہے اور یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر یونس خیال کے بیان کے مطابق کچھ دوستوں کا اصرار، بیٹے اور بھائی سے ملنے کا خیال اس سفر کا محرک بنا۔ یہ بات بھی خوشی کا باعث تھی کہ یہ سفر انھوں نے اپنی فیملی کے ساتھ کیا اور راستے میں کسی بھی رومانس کا ارتکاب نہ کیا اور نہ ہونے دیا گیا جیسا کہ کچھ سفر نامہ نگار کرتے ہیں جن سے ہر جگہ پر نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی حسینہ ٹکرا جاتی ہے۔ ڈاکٹر یونس خیال نے اس سفر کی روداد انتہائی خوب صورتی اور حقائق پر مبنی لکھی ہے جس سے اس کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ کچھ مواقع پر نظر بچا انھوں نے دل پشوری کرنے کی جو کوشش کی اس کا اپنا ہی مزا آیا اور بعض مواقع پر ان کی خوش گمانیاں بھی قابل دید تھیں۔ سفر کے دوران ہوائی میزبانوں کی مکمل میزبانی سے محروم رہے جوس اور پھیکی چائے پیتے ہوئے ان کی بے بسی پر ترس آ رہا تھا۔ شاعر تھے سو مرزا غالب کے اشعار پر گزارا کر گئے۔

انسان کہیں بھی پہنچ جائے لیکن جس جگہ پر بچپن اور جوانی کے دن گزرے ہوں وہ کبھی نہیں بھولتے ڈاکٹر صاحب کے دل میں سرگودھا کی محبت خون بن کر رگوں میں دوڑ رہی تھے جس کا ثبوت انھوں نے ولایت جا کر بھی دیا اور وہاں بھی سرگودھا، اس کی مٹی کی خوشبو، اس کی یادوں کی مہک اور پرانے دوستوں کی محبت ان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی رہی کہ وہ برطانیہ میں فلسطین کے حق میں کیے گئے مظاہروں میں

شریک ہوئے اور فلسطین کاز میں اپنا حصہ ڈالا ورنہ یہاں تو ایسا کام کرنے ہی نہیں دیا گیا اور جنھوں نے کیا ان کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔

انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی یلغار اور اس کے معاشرے پر اثرات کے حوالے سے ان کا یہ شعر بہت پسند آیا اور بار بار پڑھا۔ آپ بھی پڑھیے:

گوگل مرے سماج کی دانش کو کھا گیا
بچہ سا لگ رہا ہوں میں بچوں کے درمیاں

.....

چھوٹا منہ بڑی بات والی صورتحال ہے کہ ڈاکٹر یونس خیال جیسی بلند پایہ اور جید علمی و ادبی شخصیت کی تخلیق پر کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں مگر ایک طالب علم کی حیثیت سے جو میں نے پڑھ کر محسوس کیا اس کو قرطاس پر منتقل کر کے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر یونس خیال ایک خوب صورت مثبت اور متوازن شخصیت کے مالک ہیں۔ اپنی علمی و ادبی خدمات اور مثبت اپروچ کے باعث علمی و ادبی حلقوں میں نہایت عزت و تکریم سے دیکھے جاتے ہیں یہ عہد حاضر کے سینئر ترین شعرا و ادبا میں شامل ہیں۔ یہ بات ادب کی ترویج و ترقی میں معاون ہے کہ یہ جونیئرز کو جگہ اور سپیس دینے کے قائل ہیں۔ انھوں نے کبھی بھی جونیئرز کے ساتھ لاپرواہی، بے اعتنائی اور بے رخی نہیں برتی بلکہ ان کی راہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ادب کے ارتقائی سفر اور مراحل کے لیے سینئرز کے ایسے رویے نہایت اہمیت کی حامل ہوتے ہیں۔

ولیم ورڈزورتھ کے ساتھ ان کا مکالمہ اس کتاب کا اہم ترین باب ہے جس میں ایک مشرق کے شاعر کا ایک مغرب کے شاعر کے ساتھ ملاقات، مکالمہ اور بات چیت ہے اگرچہ درمیانی فاصلہ تقریباً اڑھائی سو برس کا ہے مگر جہاں دل کے معاملات ہوں وہاں زمان و مکان کی پابندیاں ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ ایک مغربی رومانوی، فطرت پرست شاعر اور ایک مشرقی رومانوی فطری شاعر جس کی محبت کے ساتھ ساتھ زمانے کے جبر اور چیرہ دستیوں پر بھی گہری نظر ہے جو عام آدمی کے مسائل بھی سمجھتا ہے اور ان کی بات کرنے کی جرات بھی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ایسے معاملات اور مضامین پر مکمل گرفت ہے اس ضمن میں ان کا ایک مشہور زمانہ شعر دیکھیے۔

تم محبت خرید لائے ہو
گھر میں پہلے عذاب کیا کم تھے

ڈاکٹر صاحب نے ایک نظم کی صورت میں مکالمہ کیا جو تخلیقی سطح پر ایک شہکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نظم میں ورڈزورتھ کا ہاتھ پکڑ کر اسے جھنجھوڑا اور اسے ایک دوسری دنیا میں لے گئے۔ میں اس نظم سے جو دو بند پیش کر رہا ہوں اس میں ان کا انداز دیکھیے ڈاکٹر صاحب نے بڑی نفاست اور سلیقے سے اُسے کہا کہ:

یہ سچ ہے کہ دنیا کے تخلیق کاروں
میں تم منفرد ہو
محبت، لطافت اور فطرت کے شاعر
مگر یہ کہو
تم نے غربت زدہ بستیوں میں اُتر کر
کبھی زرد چہروں کے پیچھے چھپے
کرب و آلام دیکھے:
کبھی تم نے بھوکے غلاموں کی چیخیں سنی تھیں
کھلے ساحلوں کے مناظر کے شاعر
کبھی تم نے افلاس کی آنکھ سے گرتے آنسو کو دیکھا
کبھی ایسے آنسو کی وسعت کو پایا
جہاں جانے کتنے سمندر پڑے تھے
مگر یہ تمہارا کہاں مسئلہ تھا
محبت کے شاعر تمھارا نہیں
یہ مرا مسئلہ ہے
مرا حوصلہ ہے

.....

ڈاکٹر یونس خیال اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں کسی بھی ادارے سے زیادہ علمی و ادبی اور تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ یہ اپنے کام کے ذریعے بولتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں وہاں اپنی ہی دنیا بسا لیتے ہیں۔

برطانیہ میں بھی اہل سخن اور اہل ادب نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ان کے ساتھ بیس دنوں میں مسلسل انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی کئی ادبی تنظیموں نے ظہرانوں، عشائیوں، محافل و تقاریب کا انعقاد کیے رکھا اور ڈاکٹر صاحب کی قربتوں محبتوں، صحبتوں اور حکمت و دانش سے فیضیاب ہوتے رہے۔

اس سفر نامہ میں ڈاکٹر صاحب نے وہاں کی تہذیب و ثقافت، لوگوں کے رہن سہن، خوب صورتی، نفاست سلیقہ مندی، ہنر مندی، باغات، والانوں تالابوں، کھانوں، موسم اور بارش اور وہاں پر رہنے والوں کے اعلیٰ ذوق، مہمان نوازی اور سلیقہ شعاری کی بے حد تعریف کی ہے۔ وہاں پر انھوں نے ایک شاعر اور تخلیق کار کی طرح ایک ایک چیز کا بغور مشاہدہ کیا اس کو محسوس کیا اور آخر میں اس کو قلمبند کر کے تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ انھوں نے اپنے اردگرد جو بھی دیکھا، محسوس کیا وہ اب اس سفر نامہ کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر

صاحب جزیات نگاری اور منظر نگاری کے بادشاہ ہیں۔ چیزوں کو دیکھنے کے بعد اپنی دلی جذبات اور کیفیات کو بتانا کبھی نہیں بھولتے اور جس چیز میں دل رکھ دیا جائے وہ باکمال اور لازوال ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اتنا کچھ لکھا لیکن کہیں بھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی افسانوی انداز اختیار کیا جو بھی دیکھا محسوس کیا من وعن سپرد قلم کر دیا۔ ایک اور بات کہ یہ سفر نامہ اگر پینتیس، چالیس سال پہلے لکھتے تو اس میں دلچسپی اور رنگینی کے ایک دو اور ابواب بھی شامل ہوتے ۔ نوجوان ان کو خصوصی طور پر مزے لے لے کر پڑھتے اور ولایت جانے کی حسرت ان کے دل ہیں مزید بڑھ جاتی۔

ڈاکٹر صاحب اگر چاہتے تو سویلو آبشار کے پل کے جنگلے کے ساتھ ایک تالا بھی لگا سکتے تھے اور چابی آبشار میں پھینک دیتے مگر لگتا ہے کہ ان کے پاس اب مزید تالوں کی گنجائش نہیں رہی کیونکہ اب ان کو ایک تسبیح ہی کافی ہے۔ بہرحال ایک خوبصورت نظم انہوں نے ادھر بھی لکھ ڈالی جو اپنے اندر کمال کی خوب صورتی، کیفیت اور محبت لیے ہوئے ہے جس میں انھوں نے خود اعتراف بھی کیا ہے کہ اب مزید چابیوں کو پھینکنے کا حوصلہ نہیں رہا ہے۔ اس سفر میں انھوں نے اپنے شاعر ہونے کا بھی بھرپور فائدہ اٹھایا اور مختلف مقامات پر سچویشن کے حساب سے برمحل اشعار لکھ کر اس سفر نامہ کو مزید رنگین، دلچسپ اور منفرد بنا دیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اب یہ پیرس، وینس اور نیویارک کے سفرنامے بھی لکھیں۔ سب لوگ میری اس بات سے متفق ہوں گے کہ ڈاکٹر یونس خیال محبت کرنے والی، محبتیں بانٹنے والی اور محبتیں سمیٹنے والی شخصیت ہیں یہ جہاں بھی جاتے ہیں سب کو اپنی محبتوں کے حصار میں جکڑ لیتے ہیں۔ ان کی گفتگو کی ملائمت اور خوشبو لوگوں کو مدہوش کیے رکھتی ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر یونس خیال عہد حاضر کی نابغۂ روزگار شخصیات میں شامل ہیں۔ ان کا اخلاق اور کردار کی شفافیت ہمارے لیے باعث تقلید بھی ہے اور مشعل راہ بھی۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمیں ان کی ہمراہی و ہمرکابی میسر ہے اور ہم اس کتاب کے توسط سے مزید ان کے قریب ہوئے ہیں۔ آخر میں ان کے ایک خوب صورت شعر پہ اختتام کروں گا کہ:

کیا سناؤں میں سفرنامہ تجھے
نامکمل ہے ابھی میرا سفر!

☆☆☆☆☆

منتہائے فکر اور رثائی ادب

دُنیا کے ہر خطے میں اپنے اپنے انداز اور اسلوب سے شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ پر مختلف پیرائے میں تخلیق اور تحقیق کا عمل جاری اور ساری رہا ہے اور کائنات کے وجود تک یہ مکمل آب و تاب کے ساتھ چلتا رہے گا۔ جہاں تک دُنیائے ادب کا تعلق ہے ادب کی کوئی زبان نہیں ہوتی یہ اندر کے جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ دُنیا کے ہر خطہ میں ادب ہی کی زبان کو سمجھا اور محسوس کیا گیا ہے۔ چاہے وہ لوک ادب ہو افسانوی، رومانوی، داستانی یا کہ شعری ادب ہو چاہے کسی بھی پیرائے یا صنف میں موجود ہو۔ اُس کی چاشنی اور مٹھاس ایک خاص لذت رکھتی ہے۔ دُنیا کی ہر زبان میں ادب تخلیق ہوا اور وہ زبان بولنے والے لوگ اپنے اس ادبی ورثے کے امین ہیں۔ یہ اٹل حقیقت ہے کہ ادب کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اس کی وسعت صرف اور صرف محبت ہی سے ماپی جا سکتی ہے اس کا نہ کوئی اور پیمانہ ہے اور نہ ہی پیرا میٹر جس سے ادب کی پیمائش کی جا سکے۔ تھل صحرا کے جنوب اور دریائے سندھ کے مشرقی کنارے آباد بھکر کا شہر بہت قدیم ہے۔ اس کی اپنی زبان تہذیب ثقافت اور کلچر ہے جہاں پر زیادہ تر بولنے والوں کی زبان سرائیکی ہے۔ ضلع کا زیادہ تر علاقہ ریت کے ٹیلوں صحرائے تھل پر مشتمل ہے اور دیکھا جائے تو تھل کے لوگوں کا ایک اپنا رہن سہن تہذیب کلچر بود و باش اور لباس ہے جو کہ ایک خاص خوبصورتی کا حامل ہے۔ ضلع بھکر شروع سے علم و ادب کا محور و مرکز رہا ہے اور یہاں ہر دور میں اُردو، سرائیکی اور پنجابی ادب کے لکھنے والے شاعر ادیب اور محقق موجود رہے ہیں۔ اِس دھرتی پر ہر دور میں ہر صنفِ سخن میں ادب تخلیق ہوتا رہا چاہے وہ حمد، نعت، سلام، منقبت، غزل اور نظم کی صورت میں لکھا جانے والا ہو یہ ادب شعر و ادب کی تاریخ کا حصہ رہا ہے۔ اس علاقے کو کچھی کا علاقہ بھی کہا جاتا ہے اور اس علاقے نے بہت سے نام ور اور قد آور ادب تخلیق کرنے والی شخصیات کو جنم دیا۔ جن میں غلام سکندر خان، غلام حسن تائب، فیروز ترک، نذر

سید طاہر شیرازی

حسین ترک، خلشِ پیرِ اصحابی مظفر حیدری، سید آل محمد سوز، شکیب جلالی، کلیم بخاری، بشیر احمد بشر، نذیر احمد نذیر ڈھالہ خیلوی، ڈاکٹر اللہ نواز شہانوی، اقبال حسین، ڈاکٹر اشرف کمال، علی شاہ، نجف علی شاہ بخاری، الطاف اشعر بخاری، انیل چوہان، محمد اقبال بالم اور مقبول ذکی مقبول اس کاروان کا حصہ نظر آئے۔ رثائی ادب صدیوں سے تخلیق ہوتا چلا آ رہا ہے۔ نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ہونے والے سانحہ کربلا کی نسبت سے ان علاقوں میں کربلائی ادب کے اثرات ہر دور میں نمایاں رہے ہیں اور بہت سی قد آور شخصیات اُردو اور سرائیکی زبان میں رثائی ادب تخلیق کرتی رہی ہیں۔ اسی مناسبت سے بھکر کی تحصیل منکیرہ جو کہ صحرائے تھل میں واقع ہے اس دھرتی کے باسی اور شاعر و ادیب محقق مقبول ذکی مقبول کا تذکرہ نہ کرنا ادب کے ساتھ نا انصافی ہے۔ کربلائی ادب کے حوالے سے ان کے دو شعری مجموعے ''سجدہ'' اور ''منتہائے فکر'' منظرِ عام پر آ چکے ہیں جو کہ ادبی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ کربلائی ادب لکھنے کے لیے ہر انسان اس کے اثر پزیری اور ابلاغ کا کس طرح تقاضا کرتا ہے کہ نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی کتنی عقیدت اور معرفت ہے پھر بصیرت کے حوالے ہی سے یہ کرم اللہ پاک کا اُس کی اپنی خاص عنایت کا ادراک عطا کرتا ہے۔ مقبول ذکی مقبول اللہ تعالیٰ کی ایک خاص عطا کا کرم ہے۔ اگر اُن کے مجموعہ کلام ''منتہائے فکر'' کو حقیقی حوالے سے دیکھا اور سمجھا جائے تو انسان تصوراتی طور پر معراجِ عشق پر پہنچ جاتا ہے۔ ''منتہائے فکر'' کو لغوی معنی کے پیرائے میں دیکھیں تو سوچ کی آخری بلندی بنتی ہے اور وہاں سے کہیں کریم کربلا کا اور خانوادہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام شروع ہوتا ہے تو پھر عام آدمی اُن کی فضیلیت و عظمت کو اس محدود سے دائرہ دماغ میں کیسے سموسکتا ہے۔؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی کریمی ہے جس نے کچھ نہ کچھ حصہ عطا کیا ہے۔ یہ انسان کو اُس کی اپنی حیثیت کے مطابق عطا کرتا ہے۔ جب خالق کائنات کی توحید اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو خطرہ لاحق ہوا تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کریم کے خانوادہ ہی سے سرکار امام حسین علیہ السلام نے ہی دین کی بقا و سرفرازی کے لیے قیام کیا اور علم حق بلند کر کے کربلا میں دینِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور توحید کبریا کے لیے اپنے بہتّر رفقا کے ساتھ کارزار کربلا میں سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے

ہوئے اور اِس واقعہ کو مقبول ذکی مقبول نے یوں بیان فرمایا ہے۔

آپؑ کی جو تھی امامت دین پر آئے نہ آنچ
کربلا میں کی قیادت دین پر آئے نہ آنچ

.....

آپؑ کے اصحابؓ پر راضی ہوا ہے پاک رب
یاد ہے سب کو شجاعت دین پر آئے نہ آنچ

.....

ناز کرتے ہم رہیں گے تھے بہتر باوفا
پی گئے جام شہادت دین پر آئے نہ آنچ

.....

ارجمندِ مصطفیٰؐ تھے کربلا میں سوگوار
آپؑ کی تو ہے بسالت دین پر آئے نہ آنچ

.....

یہی تو تھا فلسفہ دینِ حق جس کے لیے حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے لال علیہ السلام نے اپنا سب کچھ قربان کیا:

اِک دیا روشن کیا عاشور کی شب کربلا
پورے عالم میں ہے اُس کا ہر طرف قصہ الگ

.....

کربلا کی داستان اپنی جگہ پر ایک الگ داستانِ غم ہے اگر میدان میں حضرت عباس علیہ السلام کے بازو کٹتے ہیں تو حجاب کی صدا بلند ہوتی ہے اگر حرملہ کا تیر حضرت علی اصغر علیہ السلام کا گلہ چیرتا ہے تو اُس کی ماں رباب سلام اللہ علیہا ٹوٹ جاتی ہے اس دل سوز لمحے کو مقبول ذکی مقبول نے یوں قلم بند کیا ہے۔ پہلا شعر حضرت عباس علیہ السلام کے حوالے سے اور دوسرا حضرت علی اصغر علیہ السلام کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں۔

بازو کٹے جو نہر پر حیدرؑ کے لال کے
خیموں سے اِک صدا اُٹھی ہائے مرا حجاب

حرملہ کے تیر نے ہی تو امبر ہلا دیا
تڑپی صغیرؑ سے بھی جو بڑھ کر وہاں رُبابؑ

.....

جب طاغوتی طاقتوں اور ظلم و بربریت سے نظام حق اور حق خود ارادیت کے لیے چھ ماہ کے بچے کی قربانی بھی دینی پڑے تو ضروری ہے نظام حق کی بقا کے لیے یہ بھی لازم ہے اگر ہم آئے دن عالمی تناظر میں دیکھیں تو فلسطین اور آزاد جموں کشمیر میں نظام حق اور حق خود ارادیت کے لیے چھ چھ ماہ بچوں کی قربانیاں پیش کی جارہی ہیں۔ اِس کا آغاز بھی یوم عاشورہ کربلا سے ہوا تھا۔ اِسی تناظر میں اُن کا ایک یہ شعر بطور نمونہ پیش ہے:

رادِ حق پر دیا بیٹا وہ تھا معصومؑ چھ ماہ کا
کہا تھا فوجِ ظالم سے بچائیں گے نظامِ حق

.....

مقبول ذکی مقبول جتنا خوب صورت شاعر ہے اُتنا خوبصورت انسان بھی ہے اِن کے علاوہ اُن کے مزید شعری مجموعے" یہ

میرا بھکر،، (فردیات) فروری 2024 میں شائع ہوا

'' انداز بیاں دیکھ'' (اُردو ، پنجابی اور سرائیکی شاعری) 14 اگست 2024 میں شائع ہوا۔

مقبول ذکی مقبول شاعری کے ساتھ ساتھ مختلف تحقیقی مضامین پر مبنی کتابیں لکھ چکے ہیں جو کہ '' شذراتِ مقبول'' مضامین و تبصرے کی کتاب جنوری 2024 میں شائع ہو چکی ہے۔ تحقیق کے حوالے سے بھی منکیرہ میں اور دور دراز تک کے علاقوں میں ان کے ادبی طور پر روابط موجود ہیں جو کہ مقبول ذکی مقبول کی ادب دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ کئی بار میرے ہاں جھوک شیرازی ، جھنگ میں تشریف لائے اور جھنگ کے مختلف ادبی پروگراموں کا حصہ بنتے رہے ہیں اور میرے ساتھ تو اُن کا ایک خاص عشق کا رشتہ ہے جو ہم کو جوڑے رکھتا ہے تحقیق کے حوالے سے جو اُن کی مختلف ادبی شخصیات سے ملاقاتیں رہی ہیں اُن کو ترتیب دے کر انٹرویوز کی شکل بنا کر اُن کو کتابی صورت میں شائع کر کے عظیم ادبی سرمائے کو محفوظ کیا اور ایک ادبی تاریخ مرتب کی '' سنہرے لوگ'' جون 2023 اور '' روشن چہرے'' جولائی 2023 اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ '' اعترافِ فن'' عاصم بخاری تحقیق و تنقید پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جو یکم جنوری 2024 میں چھپ چکی ہے اُس کے ساتھ ساتھ '' عاصم بخاری: شخصیت اور شاعر'' کے نام سے کتاب فروری 2025 میں چھپ چکی ہے۔ یہ بھی مقبول ذکی مقبول کی تحقیق کا سرچشمہ ہے۔ '' سید حُب دار قائم: جگمگاتا ستارہ ،، کے عنوان سے ایک کتاب فروری 2025 میں شائع کر کے مؤلف و محقق کے طور پر بھی سامنے آ چکے ہیں۔ ادب کے میدان میں جب ہم مقبول ذکی مقبول بطور شاعر و ادیب اور محقق دیکھتے ہیں تو اُن کی شخصیت واضح طور پر سامنے آتی ہے۔

صحرائے تھل کی پیاس کو مقبول ذکی مقبول علم و ادب سے بجھانے کے لیے سرگرداں ہیں۔ ذہنی سکون اور ادبی مسرت کے لیے شعر و ادب تخلیق کر کے اپنی دھرتی کے ساتھ محبت کا قرض اُتارنے کی کوشش کر رہیں ہیں۔ ہر انسان پر اُس کے علاقہ کی مٹی کا حق ہوتا ہے۔ جس نے اُس کو جنم دیا ہوتا ہے۔ اُس کا قرض اُتارنا بھی واجب ہے۔ مقبول ذکی مقبول کی سعی و کوشش اسی ادائیگی قرض کی ایک کڑی ہے۔

☆☆☆☆☆

سخنِ تازہ کی شاعرہ..... پروین سجل

فنونِ لطیفہ کی صنف ادب زمانہ قدیم سے مقبول ترین صنف ہے اور صنف ادب میں سب سے زیادہ مقبول صنف غزل ہے۔ یہ وہ صنف جو لکھنے والا لکھتا ہی جاتا ہے اور گانے والا گاتا ہی جاتا ہے یہی نہیں اس کا مطالعہ کرنے والا پڑھتا ہی جاتا ہے، اس کی وجہ غزل کے نئے رنگ ہیں غزل ہر دور میں کسی نئے خیال میں قاری کے سامنے آئی جس کی وجہ سے توجہ کا مرکز ہے۔

غزل کا ہر شعر الگ سے منظر کو پیش کرتا ہے جس سے پانچ یا اس سے زائد اشعار میں مختلف مضامین شامل ہوتے ہیں کبھی کبھی غزل جمالیاتی رنگ میں اپنا قد بڑھاتی ہے اور کبھی حقیقی در سے روشن ہوتی نظر آتی ہے۔ اس صنف میں کسی منظر کو چاہے وہ عارضی ہو چاہے وہ دائمی ہو چاہے وہ خوابی ہو چاہے وہ ناممکنات میں سے ہو چاہے وہ درد والم کی چیخ ہو چاہے وہ حسن کی تعریف ہو چاہے وہ غم کی داستاں ہو چاہے موسموں کا رنگیں مزاج ہو چاہے وہ روداد غربت ہو چاہے وہ دل کی باتیں ہوں چاہے وہ اشکوں کا سمندر ہو چاہے وہ زخموں کی مالا ہو غرض یہ کہ ہر منظر ہر حادثہ، ہر واقعہ، ہر انداز فکر اس میں سمونے کی جگہ ہے۔

یہی وجہ ہے قاری کو مطالعہ میں لطف اور لکھاری کو مضامین سمیٹنے کا موقع ملتا ہے اسی موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے محترمہ پروین سجل نے نجانے کتنے موضوعات سخن کو مجموعہ ''صاحب'' میں سجایا ہے پروین سجل چوں کہ کہنہ مشق اور مسلسل لکھاری ہیں اب تک ان کے ۱۲ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں ''ممکن'' سے شروع ہونے والا سفر ''تکیہ'' تک کا سفر کامیابی سے طے کرنے کے بعد اگلے پڑاو کی جانب رواں ہے ہم آج بات کریں گے ان کے شعری مجموعہ ''صاحب'' پر اور جو ان کا تازہ شعری مجموعہ ''تکیہ'' اس پر پھر کسی دن اظہار خیال ہو گا کیوں کہ وہ مجموعہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔

پروین سجل انتہائی سلجھی ہوئی اور معتبر ادبی

عرفان خانی

شخصیت کے جانی پہچانی جانے والی شاعرہ، ادیبہ اور صحافی ہیں ،ان کو علوم پر خاصی دسترس حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں الفاظ کا خاصا ذخیرہ ہے جو طویل کہانی، حادثہ کو چند الفاظ میں بیان کرنے کی خاصیت رکھتا ہے ایک اچھے لکھاری کی پہچان ہی کم الفاظ میں مقصد سمیٹنا ہے ورنہ شعر اور کہانی، افسانہ وغیرہ میں فرق جاننا مشکل ہو جاتا۔ طویل خیال و خواب کو دو مصرع میں ایسے قید کرنا کہ جب اس کی تشریح ہو تو کئی صفحات پر مشتمل ہو اسی کا نام شعر ہے۔

بلاشبہ پروین سجل کے اشعار اس میعار پر ہیں کہ وہ شعر ہیں اور وہ اشعار میں ہر منظر کو ڈھالنے کی دسترس رکھتی ہے کوئی بھی شاعرہ جب غزل کی جانب آئی تو سب سے پہلے نقاد کی نگاہ اس کے نسائی ادب کی جانب گئی کیوں کہ وہ صنف نازک ہے ظاہر ہے صنف نازک کا لہجہ نسائی خواہش و خواب سے جڑا ہے مگر کچھ شاعرات کے ہاں نسائی لہجہ کم کم ملا اس کی وجہ کہ وہ آپ بیتی کے خیال پر نہیں بل کہ عوام بیتی اور حالات حاضرہ کی حس کی مالکہ ہے جو اپنے دکھ درد اپنی خواہشوں اپنے خوابوں کے بجائے انسانی درد و الم کو محسوس کرنے لگی، قدرتی مناظر سے قربت بڑھانے لگی اور یہی مقام نسائی حس کی نازکی کا وہ مقام ہوتا ہے جہاں سے اک پختہ کار شاعرہ کے خیال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ اشعار منفرد خیال سے مزین اور اسلوب سخن کی پہچان ہو سکتی ہے۔

پروین سجل کے ہاں رومانی اسلوب بہت کم ہے فقر اور فکر کے ساتھ حقیقی اسلوب ان کے ہاں زیادہ ہے جس کی وجہ وہ دور حاضر کی شاعرات میں منفرد اسلوب کی شاعرہ ہیں ان کے اشعار میں قرب ممکنات اور تلاش فقر ہے جو کہ مفکرانہ سوچ کے اس دھارے پر لے جاتا ہے جہاں سے بہت دور کا منظر بھی قریب دیکھا جا سکتا ہے شاعر یا تو منظر واقعہ، حادثہ کو دیکھ کر شعر کہتا ہے یا پھر وہ اس کیفیت سے گزر کر شعر تخلیق کرتا ہے یا پھر اسے الہامی طور شعر ملتا ہے محسوسات اور حساسیت بھی ذریعہ شعر ہیں۔

جیسا کہ یہ شعر اک ایسا شعر جس میں کرب کا وہ خیال ہے جسے شعر میں سموتے ہوئے شاعر کی کیفیت کا اندازہ کر سکتے ہیں اندھیری رات بھی ہو اور چراغ جو امید کا سہارا ہو وہ بھی بجھ جائے اس کے بجھنے سے سایے بھی بجھ جائیں خاص اشارہ یہ کہ سایے سے سایہ الگ ہونا یہ نیا اچھوتا خیال ہے جسے شاعرہ نے بخوبی نبھایا ہے۔

مطالعہ کیجئے:

جلتا چراغ بجھ گیا سایے بھی بجھ گئے
تیرہ شبی نے سایے سے سایہ الگ کیا۔

.....

پرانے خیال کو نئے انداز میں بیان کرنا ہی دسترسِ فن کا خاصا ہے جیسے:

فقط کچے گھڑے کے واسطے میں
یہ دریا ہاتھ سے روکے کھڑی ہوں

.....

شاعرہ نے اشعار میں فرضیات ولفظیات سے کام نہیں لیا بلکہ حقیقی خیال کا پیرہن پہنایا ہے اس شعر میں نیا رنگ یہ ہے سایے کو بستر بنا دیا یہ جدید رنگ ہے جس میں شاعرہ نے ناممکن کو ممکن بنا دیا شعر دیکھیں:

کیا وجود خام سے لپٹی تھکن
کھول کر سایا ہی بستر کر لیا

چند اشعار آپ کے ذوق سخن کے لیے:

گردشِ چرخ چین لینے دو
تنگیء جاں کو آستیں کافی

.....

پاؤں ڈالے تھے جونہی پانی میں
بول اٹھے کنارے آپس میں

.....

شہر سارا نہ اٹھا صبح تلک
موجہء گل نے جو نافہ چھوڑا

سب سجل چھوڑ دیا چھوڑ دیا
ذکر تیرے کا نہ کلمہ چھوڑا

.....

جیسا کہ اوپر کہا گیا شاعرہ کا نسائی رنگ کم اور حقیقت کا شعری رنگ زیادہ ہے، پروین سجل کو علوم سخن پر جو دسترس ہے ان کے عمیق سخنی اور علمی بصیرت کا ثبوت اپنے اشعار میں بڑی خوبی سے بیان کرتی ملتی ہے جیسا ایک شعر:

مری آنچل کی سلوٹ ناپتے ہو
تری دستار کے خط سب پرانے

.....

غرض یہ ''صاحب'' کی تخلیقارہ نہ صرف روائیت سے جڑی بلکہ جدید ادب میں بھی اپنا حصہ شامل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے اچھوتے اور جدید اشعار کا نیا پن خود بخود شاعرہ کی ادبی قدامت کا فیصلہ دیتے نظر آتے ہیں۔ان کا اس سے قبل کا شعری مجموعہ ''تکیہ'' بھی میرے مطالعہ میں ہے جو کہ ''صاحب'' کے بعد مجھے ملا اس مجموعہ میں ان کا سخنی وجدان بھرپور انداز میں اچھی اور جدید شاعرہ کے طور سامنے آئے گا، کچھ دنوں بعد اظہار خیال شائع کروں گا۔

مجموعہ ''صاحب'' پر لکھتے وقت محسوس ہوا کہ یہ مجموعہ بھی کئی صفحات کا مضمون لکھنے پر مجبور کر رہا ہے مگر کتاب چہرہ پر کوئی مطالعہ نہیں کرتا یہ وجہ ہے کہ اسے مختصر شائع کیا، ورنہ پروین سجل کی شاعری موضوعات کے حوالہ سے اک داستاں نہیں بلکہ کئی داستانوں پر مشتمل ہے جس کا میرا سلسلہ ''کتاب چہرہ'' پر احاطہ ممکن نہیں۔

میری دعا کہ محترمہ پروین سجل اپنے کھرے، سچے اور حقیقی خیالات کے ساتھ ہمیشہ سربلند رہے۔ آمین

☆☆☆☆☆

نذر عابد: ایک درویش شاعر

مرے وجود کے روزن سے روشنی پھوٹے
میں وہ چراغ جلا کر مکان میں رکھوں
(شہرِ صدا)

سہ ماہی مجلّہ ''دھنک رنگ'' جنوری تا مارچ 2024 ڈاک کے ذریعے موصول ہوا تو دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ادارے نے اس شمارے میں اُردو ادب کے ایک منجھے ہوئے ادیب، شاعر، نقاد اور استاد ڈاکٹر نذر عابد کے حوالے سے ایک خصوصی گوشہ شامل کیا ہے جس میں ملک بھر سے ان کے چاہنے والوں نے اُن کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اپنے اپنے خیالات اور آرا کو مختلف مضامین کی شکل میں قلم بند کیا ہے۔ مدیر اعلیٰ حسین امجد اور مدیر سجاد حسین سرمد کا یہ اقدام لائقِ تحسین و آفرین ہے۔ یہ مضامین تعریفی بھی ہیں اور تنقیدی بھی۔ جن کے مطالعے سے ڈاکٹر نذر عابد کی شخصیت اور فن کے اُن پوشیدہ گوشوں تک رسائی ملتی ہے جو عام طور پر نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی منفرد شخصیت اور ان کا ادبی مقام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ ڈاکٹر سید زبیر شاہ نذر عابد کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''میں نہیں جانتا کہ ان کی شخصیت کی کثیر الجہات سے متعلق باقی لوگ کیا رائے رکھتے ہیں کیونکہ بظاہر وہ کئی شعبوں میں اپنی پہچان رکھتے ہیں لیکن میرے لیے نذر عابد ایک ہی ہیں جن کو میں نے ہر شعبے میں ایک ہی رنگ و روپ میں دیکھا۔ سیدھا سادہ، بامروت، پُرخلوص، تعلق میں دوغلے پن سے کوسوں دور، زندگی کے دوہرے معیار سے آزاد، گہرا مشاہدہ رکھنے والا تخلیقی ذہن، ہر قدم پر رہنمائی اور تعاون کرنے والا انسان''۔ ڈاکٹر نذر عابد ایک ہمہ جہت شخصیت اور درویش صفت انسان ہیں۔ سید زبیر شاہ نے ان کی شخصیت کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور اس سے بہتر ان کی شخصیت کے بارے میں کلام کرنا مشکل ہے۔ اُن کا شمار اردو ادب کے اُن چند معدودے لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے نہ صرف شاعری

شبیر احمد آکاش

میں اپنے نام کا سکہ بٹھایا بلکہ دیگر اصناف سخن میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ اس خصوصی شمارے میں ڈاکٹر نذر عابد کی شخصیت و فن پر مختلف زاویوں سے مضامین لکھنے والوں میں ڈاکٹر نثار ترابی، ندیم افضال، سید نصرت بخاری، ڈاکٹر عزیز عاصم، ڈاکٹر عامر سہیل، ڈاکٹر ناہید اختر، ڈاکٹر سید زبیر شاہ، ڈاکٹر خاور چودھری اور ڈاکٹر محمد اویس قرنی کے علاوہ دریائے ادب کے دیگر اہم شناور بھی شامل ہیں۔

نذر محمد عابد ڈھوک دوست محمد، موضع باسیہ، تحصیل حضرو، ضلع اٹک میں حاجی ملک دوست محمد کے گھر اپریل 1963 کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں موجود پرائمری سکول سے حاصل کی اور میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول، شادی خان، ضلع اٹک سے 1979 میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اٹک ایک پسماندہ علاقہ تھا اور وہاں مزید تعلیم کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے لہٰذا انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان فیڈرل گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، اسلام آباد سے 1981 میں پاس کیا۔ بی اے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے 1984 میں مکمل کیا اس کے بعد ایک قومی بینک میں ملازمت اختیار کر لی اور بارہ سال کی قلیل مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد گولڈن شیک ہینڈ کے تحت بینک سے سبکدوش ہو گئے۔ ملازمت کے دوران ہی انھیں اپنی ادھوری تعلیم کی تکمیل کا خیال آیا تو انھوں نے ایم اے (اُردو) کا امتحان بطور پرائیویٹ امیدوار کے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے 1988 میں پاس کیا۔

کہتے ہیں کہ ''شوق دا کوئی مل نئیں'' علم کی جستجو انسان کو غم روزگار بھی بھلا دیتی ہے کچھ ایسا ہی معاملہ ہمیں نذر عابد کے ساتھ بھی ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ انھوں نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے فوراً بعد علم کے حصول اور درس و تدریس کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا پسند کیا جس کی بنیادی وجہ ان کا وہ ادبی مزاج تھا جس کے لیے انھوں نے بینک کی آرام دہ نوکری کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ دیا۔ اسی ذوق و شوق کو پورا کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز گیریژن کیڈٹ کالج، کوہاٹ سے کیا اور عرصہ تین سال تک اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے پھر مختصر عرصے کے لیے شہر اقتدار میں واقع او پی ایف کالج میں بحیثیت لیکچرار (اُردو) اُن کی تعیناتی عمل میں لائی گئی جہاں انھوں نے بڑی جانفشانی، محبت اور لگن سے ادب کے طلبا و طالبات میں علم کی شمع جگانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ انھوں نے ایم اے تک تو تعلیم جیسے تیسے حاصل کر لی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جدید دور کے

تقاضے بھی بدلنے لگے اب ایم اے کی تعلیم کو کافی نہیں سمجھا جاتا تھا بل کہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح تک تعلیم کے مواقع میسر آ گئے تھے جس کے حصول کے لیے معیاری تحقیقی مقالہ لکھنے کے بعد ہی طالب علم کو ڈگری سے نوازا جاتا تھا۔ لہٰذا وہ بھی اپنے من میں لگی علم کی پیاس کو بجھانے کے لیے پھولوں کے شہر پشاور ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور قرطبہ یونیورسٹی، پشاور میں ایم فل لیڈنگ ٹو پی ایچ ڈی پروگرام میں داخلہ لے لیا۔ اس پروگرام کے تحت انھوں نے ہزارہ کے معروف اقبال شناس اور ماہرِ تعلیم پروفیسر ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کی نگرانی میں ''میر انیس کے مرثیوں میں پیکر تراشی'' کے عنوان پر نہایت مدلل اور جامع مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

نذر عابد بنیادی طور پر غزل کے میدان میں شہسواری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے صرف غزل ہی نہیں کہی بلکہ نظم میں بھی طبع آزمائی کی۔ اُن کیاب تک منظر عام پر آئے ہوئے غزلیات کے مجموعوں میں ''شہرِ صد 2000'' میں شائع ہوا، جبکہ دوسرا مجموعہ ''کنارِ خواب'' کے عنوان سے 2012 میں منظر عام پر آیا۔ نذر عابد کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر خاور رقم طراز ہیں کہ ''ڈاکٹر صاحب عمدہ محقق اور نقاد تو ہیں ہی، شاعر بھی باکمال ہیں۔ اُنھوں نے زبان کی صحت کا خاص خیال رکھا اور شعری لوازم کو روبہ راہ کر کے اپنے لیے سمتوں کا تعین کیا۔ ان کے شعر میں جذبہ ہیجان نہیں بنتا بل کہ ایک ٹھنڈے چشمے کی صورت اختیار کر کے قاری کو طمانیت سے ہم کنار کرتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں شعلہ جوالہ کا احساس بھی ہوتا ہے۔'' ان کا پہلا نعتیہ مجموعہ ''برگِ نعت'' کے عنوان سے 2022 میں اشاعت کے مرحلے سے گزرا۔

وہ ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ محقق اور نقاد بھی ہیں۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی زیادہ تر شاعری ہی کے اردگرد گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی اور جدید شعرا کی شاعری پر مختلف فکری اور فنی حوالوں سے تجزیاتی اور تنقیدی مضامین لکھے اور ان مضامین پر مشتمل مجموعہ ''ساتواں رنگ'' کے عنوان سے 2017 میں شائع ہوا جبکہ ان کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ''میر انیس کی امیجری'' کے عنوان سے 2022 میں نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد نے شائع کیا۔ حال ہی میں ان کا تازہ شعری مجموعہ ''درِ خاک'' بھی منظر عام پر آ گیا ہے۔

محقق کی ایک نشانی یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وہ ہر دم جستجو میں رہتا ہے اس کے سامنے جو بھی بات کی جائے وہ اس کی طے تک پہنچنا چاہتا ہے۔ نذر عابد بھی انھی محققین میں سے ایک

ہیں جو ہر لمحہ کچھ نہ کچھ نیا کرنا چاہتے ہیں اور ادب کے فروغ کے لیے ہر دم مگن رہتے ہیں۔ اُن کی دیگر ادبی خدمات میں ''رسالہ اکیسویں صدی'' کا اجرا سرفہرست ہے۔ دوران تعلیم قرطبہ یونیورسٹی، پشاور میں ''قرطبہ رسالے کا'' سیرت نمبر'' شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ جب شعبہ اُردو، ہزارہ یونیورسٹی میں ان کی تعیناتی عمل میں لائی گئی تو وہاں بھی انھوں نے اپنے دست ہنر کو آزمایا اور شعبہ اردو کے تحقیقی مجلّے ''ادراک'' کے بانی مدیر کے طور پر تحقیق و تنقید کے عمل کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے نہ صرف خود تحقیق کی بل کہ اپنے شاگردوں سے بھی یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے لیا۔ اُن کے زیر نگرانی خاصی تعداد میں طالب علموں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے مقالہ جات لکھے۔ اس کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں میں ان کی شخصیت اور فن پر آٹھ کے قریب تحقیقی مقالے تا حال لکھے جا چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر ان کو مختلف صوبائی و علاقائی اعزازات سے بھی نوازا گیا جن میں ''قلم قافلہ کھاریاں غزل ایوارڈ'' 1994ء، ''منظور عارف ادبی ایوارڈ چھچھ چوراسی حضرو، 2022''، ''کوکب و آزاد ایوارڈ برائے اعتراف ادبی خدمات، 2023''، پنجابی ادبی تنظیم ''مہکاں'' ادبی ایوارڈ برائے برگِ نعت، 2023ء''، ''ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ادبی ایوارڈ، چھچھ چوراسی حضرو، 2023''، وغیرہ شامل ہیں۔

نذر عابد کی منفرد شخصیت کا عکس اُن کی شاعری میں بھی دیکھا جا سکتا ہے انھوں نے اپنے احساسات اور جذبات کے اظہار کے لیے روایتی اصناف سخن غزل اور نظم ہی کو منتخب کیا۔ وہ ضرور روایت کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر ہر وقت اسی کا دم نہیں بھرتے بلکہ اپنی فطری انفرادیت کی بدولت جدت طرازی کے علمبردار بھی بن کر ابھرتے ہیں۔ انھوں نے غزل میں روایتی مضامین بھی باندھے اور زمانے کے ساتھ بدلتے رجحانات کو بھی اپنے انداز میں بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری میں سماجی، معاشی، نفسیاتی اور سائنسی مضامین کی بھی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ سماجی ناانصافیوں کے بارے میں کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرنا بھی ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ ایک ادیب، محقق اور شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اُردو ادب کی ترقی و ترویج کے لیے نہ صرف گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں بل کہ آئندگان ادب کے لیے بھی ایک عمدہ مثال قائم کر کے ثابت کر دیا ہے کہ اگر کوئی صدق دل، محنت اور لگن سے کام کرے تو کوئی بھی شے اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔

☆☆☆☆☆

عورت مارچ ..... فطرت یا مافوق الفطرت

گاڑی کی سپیڈ کچھ زیادہ تھی لیکن اتنی تیز بھی نہیں تھی کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آ جائے لیکن وہ صاحب اچانک نجانے کہاں سے گاڑی کے سامنے آ گئے مشکل سے ہی سہی بریک لگائی اور فوراً گاڑی سے باہر نکلی اسی اثنا میں بہت سے لوگ بھی اکٹھے ہو چکے تھے ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھی تو یکا یک دل دہل سا گیا یہ صاحب تو ہمارے پڑوسی انکل شہوار تھے جو چند ماہ قبل تک قریباً پندرہ سال کے لگ بھگ ہمارے ساتھ والے مکان میں اپنی بیگم اور ۳ پیارے پیارے بچوں کے ساتھ رہائش پذیر رہے۔ انتہائی نفیس، دھیمے مزاج کے حامل پُر خلوص اور با اصول انسان، ان کی بیگم بھی بہت اچھی خاتون تھیں دونوں ایک دوسرے کے مزاج آشنا تھے پندرہ سال میں کسی ایک دن بھی ان کی جانب سے کوئی نامناسب واقعہ پیش نہیں آیا تھا بلکہ وہ پوری سوسائٹی میں آئیڈیل جوڑی کے نام سے جانے جاتے تھے اور سب انہیں رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے!!!

وہی شہوار انکل اس وقت میرے سامنے نیم بے ہوش حالت میں پڑے تھے چند مہربانوں کی مدد سے انھیں گاڑی میں بٹھایا اور قریبی کلینک لے گئی وہاں جا کر معلوم ہوا کہ شوگر لیول ڈاؤن ہونے کی وجہ سے یہ تمام معاملہ پیش آیا۔ انکل شہوار نے ہوش میں آتے ہی مجھے پہچان لیا خوشگوار حیرت کا اظہار کیا شکریہ کے جملے ادا کیے اور اسی وقت ڈرپ ختم ہونے سے پہلے ہی واپس گھر جانے کی ضد پکڑ لی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے کہ کھانے کے لیے کچھ لینے نکلا تھا بچے بھوکے ہوں گے منتظر ہوں گے انھوں نے صبح سے ناشتہ بھی نہیں کیا خیریت تو ہے انکل؟ بچوں نے ناشتہ کیوں نہیں کیا کیا آنٹی گھر پر نہیں ہیں کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے آنٹی تو ان معاملات میں وقت کی پابند اور ماشاء اللہ کافی ایکٹو ہیں پھر آج ایسا کیوں؟ حیرانگی کے عالم میں ہم نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے لیکن یہ کیا؟ انکل شہوار بجائے جواب دینے کے زار و قطار رونے لگے انھوں نے حتی الامکان کوشش کی کہ خود پر کنٹرول رکھ سکیں لیکن یہ کوشش ناکام رہی ایک انتہائی مضبوط اور سمجھدار انسان جس کے چہرے پر

فاطمہ رداغوری

ہمیشہ خوب صورت مسکراہٹ دیکھی ہو اس کا اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دینا میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھا!!!

وہ جیسے کسی ایسے کی تلاش میں ہی تھے جس سے اپنا دُکھ بانٹ سکیں کہنے لگے بیٹا ہمارے ہنستے بستے گھر کو نجانے کس کی نظر لگ گئی ہے آپ کی آنٹی کو کچھ ہو گیا ہے بچوں کا خیال رکھنے کے لیے اوقات بانٹنے لگی ہے کہتی ہے کہ صرف میں ہی سارا دن اور ساری رات ذمے داریاں کیوں نبھاؤں ہر معاملے میں عجیب سی ضد پکڑ کر بیٹھ گئی ہے اسے اپنی ذات پر جو یقین تھا، ذمے داریوں کا احساس تھا، گھر سے، بچوں سے، مجھ سے جو لگاؤ تھا وہ جیسے دھیرے دھیرے چھنتا جا رہا ہے بچے بھی اس کے رویے سے پریشان ہیں پوچھا یہ سب کیا ہے تو ہر جملے میں میری مرضی میری مرضی کی گردان سنانے لگی-- اس کا لہجہ مہذب نہیں رہا، اس کی باتوں میں شیرینی نہیں مٹھاس نہیں رہی، محبت کہیں دکھائی نہیں دیتی، ہر وقت گھر میں طوفان بدتمیزی مچا رکھا ہے، عجیب سے مقابلے کی فضا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گھر میں فیملی نہیں رہتی سب دشمن ہیں جو ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں میرا گھر اب سکون کا گہوارہ نہیں رہا میدان جنگ بن چکا ہے معلوم نہیں کون لوگ ہیں جو عجیب و غریب برین واشنگ کے ذریعے ہمارے ہنستے بستے گھروں کو ویران کر دینے میں مصروف عمل ہیں انکل ایک مرتبہ پھر رونے لگے ایک مرد کے لیے اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا یقیناً بہت مشکل ہوتا ہے اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب وہ بری طرح ٹوٹ چکا ہو-- انھوں نے اور بھی کئی دکھی کر دینے والی باتوں کو بیان کیا لیکن ان سطور میں انکا ذکر مناسب نہیں!!

وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا معاشرہ تو ایسا ہے کہ ہم جب کسی سفر پر نکلتے ہیں مرد خود بیٹھتے ہیں جب کہ ماں، بہن بیٹی کو عزت سے بٹھا کر جھک کر گاڑی کا دروازہ خود بند کیا جاتا ہے، راستے میں کوئی مسئلہ درپیش آ جائے تو باپ بھائی یا شوہر باہر نکل کر ہر مشکل کا سامنا کرتے ہیں اور خواتین کو عزت سے گاڑی کے اندر محفوظ طریقے سے بٹھایا جاتا ہے، ہجوم میں سے گزرنا ہو تو ساتھ موجود مرد حضرات خواتین کو اپنے بازوؤں کے حصار میں تحفظ کے ساتھ گزارتے ہیں ہر لحہ ہر لحظہ ہر جگہ پر خواتین کو عزت و مقام دیا جاتا ہے اور اب تو خواتین ہر شعبہ میں مرد کے شانہ بہ شانہ موجود ہیں اور بہترین طریقے سے ہر شعبے میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہی ہیں تو پھر معاشرے میں یہ افراتفری اور بغاوت کے جذبات کو ہوا دینا چہ معنی دارد؟؟ ہاں یہ سچ ہے کہ کہیں کہیں عورت ظلم و ستم یا ناانصافی کا شکار ہے لیکن اس کا حل بھی عورت مارچ اور بغاوت ہرگز نہیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی عورتوں کو بغاوت کی جانب مائل کرنے کے بجائے وہاں کے مردوں کو شعور دینے کی کوشش کی جائے اس حوالے سے آگاہی سیمینارز کا زیادہ سے زیادہ انعقاد کیا جائے کیونکہ ہمارے یہاں محض

شعور کی کمی ہے جب معاشرے میں شعور پیدا ہو گا تو ظلم، ناانصافی اور دیگر مکروہات خود بہ خود جاتے رہیں گے لیکن جس قسم کا حل عورت مارچ کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی جارہی ہے وہ کسی طور مناسب عمل نہیں یہ ہماری اقدار، روایات اور قانون فطرت کے منافی ہے اور جو چیز مافوق الفطرت ہو وہ کبھی بھی بہتری کی ضامن نہیں ہوتی !!! میں تذبذب کے عالم میں ان کی باتیں سن رہی تھی کلینک کا سٹاف بھی ان کی باتیں سن کر افسردہ سا دکھائی دے رہا تھا کسی کے پاس ان کے سوالات کا جواب نہیں تھا لیکن تسلی ہر کسی کے پاس ضرور تھی۔

جبکہ مجھے اس دفعہ ہونے والے عورت مارچ کے سیاق و سباق، مطالبات اور پلے کارڈز پر لکھی سطور یاد کرتے ہوئے ایک واقعہ یاد آنے لگا۔

روایت ہے کہ ایک بادشاہ سلامت نے محسوس کیا کہ میرے پاس ہر نعمت ہر آسائش ہے لیکن سکون و اطمینان نہیں ہے جبکہ میرے دربار میں موجود تمام ملازمین کے پاس زندگی بسر کرنے کے لیے خاص وسائل بھی نہیں پھر بھی وہ سب بلا کے مطمئن ہیں بادشاہ سلامت نے بہت سوچا لیکن کوئی حل نہ ملا بالآخر انھوں نے اپنے مشیرِ خاص سے کہا کہ اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے مجھے اس کا جواب چاہیے۔

مشیر خاصا سمجھدار تھا اس نے کہا بادشاہ سلامت آپ رات گئے ایک پوٹلی میں ننانوے اشرفیاں ڈالئے اور پوٹلی کے اوپر نمایاں حروف میں ''ایک سو اشرفی'' لکھ دیجئے اور کسی بھی ملازم کے دروازے کی سامنے رکھ کر کہیں چھپ کر تماشا دیکھئے آپکو اس سوال کا جواب مل جائے گا بادشاہ نے ایسا ہی کیا پوٹلی دروازے میں رکھ کے دروازہ کھٹکھٹایا اور درخت کی اوٹ میں چھپ گیا اتنے میں ملازم باہر آیا اس نے پوٹلی اٹھائی اس کے اوپر لکھی عبارت دیکھی اشرفیاں گنیں تو وہ ننانوے تھیں اس نے گھر سے بیوی کو بھی باہر بلایا اور بتایا کہ یہاں سو اشرفیاں ہونا چاہئیں جبکہ ایک اشرفی کم ہے تم بھی ڈھونڈو میں بھی تلاش کرتا ہوں دونوں میاں بیوی ساری رات تلاش کرتے رہے وہ ایک اشرفی نہ ملنا تھی نہ ملی اگلے دن ملازم محل میں آیا تو ایک اشرفی نہ ملنے کا غم اور ساری رات جاگنے کی تھکان اس کے چہرے سے ظاہر تھی وہ ننانوے اشرفیوں کے مل جانے پر اتنا خوش نہیں تھا جتنا پریشان آخری ایک اشرفی کے نہ ملنے کی وجہ سے تھا بادشاہ سمجھ گیا کہ اس کی بے چینی کی وجہ اس کے پاس موجود نعمتوں کی ناشکری اور جو نہیں مل سکا اس کا انتظار ہے!!!

عورت مارچ کے حوالے سے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ آج کے دور میں ہم الحمدللہ باشعور ہو چکے ہیں اور ہماری خواتین کے پاس ۹۹ اشرفیاں موجود ہیں جہاں کمی ہے وہاں شعور کی کمی ہے بے شعور معاشرہ بغاوت اور انارکی پھیلاتا ہے خدارا محض ۹۹ اشرفیاں پس پشت ڈال کر ایک اشرفی کی تلاش میں افراتفری اور بے چینی پھیلانے سے کچھ نہیں ہوگا، بات کیجیے شعور علم و عقل کے ساتھ!!!

☆☆☆☆☆

سیمیں کرن: خود اور خودی کی الجھنوں کو سلجھاتی ہوئی ایک پیچیدہ روح

اس کائنات میں جو معجزہ مجھے سب سے زیادہ حیرت میں ڈالتا ہے وہ تخلیق کا معجزہ ہے۔ تخلیق ایک لمحہ کی ہو یا کائنات کی وہ مجھے ہمیشہ حیرت میں ڈالے رکھتی ہے۔ لمحے اور کائنات کی تخلیق کے درمیان سب سے حیرت انگیز معجزہ زندگی کی تخلیق ہے۔ جو لوگ اس پیچیدہ اور تہہ در تہہ الجھتی زندگی کے معجزے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مجھے اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ کیونکہ کے ''مربعوں کی (اس) دائرہ کہانی'' کو سمجھنے کے لیے اس عظیم ترین تخلیق کار کو سمجھنا بھی ضروری ہے جس نے زندگی کے پیچیدہ ترین معجزہ کو تخلیق کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیق کو سمجھنے کے لیے تخلیق کار کو جاننا ضروری ہے اور تخلیق کار جاننے کے لیے اس کی تخلیق کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ زندگی کے سفر کے ساتھ ساتھ تخلیق کو سمجھنے کے لیے ''جلتی بے خبری سے کرن کا جنم'' ہوا اور مجھے قوی امید ہے کہ یہ سفر ''دھندلی آخری سوچ کے اس پار'' تک جاری رہے گا اور اس کا خاتمہ ''مکالمے کی موت'' کے بعد ہی ہوگا۔

تخلیق کے سفر کو سمجھنے کے لئے بحر تخیلات اور تخلیقات میں گھوڑے دوڑانے والوں میں خود اور خودی کو تلاشتی ہوئی انتہائی سادہ لبادے میں الجھی ہوئی ایک پیچیدہ روح سیمیں کرن کی بھی ہے۔ جس نے اس مادی اور روحانی تخلیق کو سمجھنے کے لیے اپنے روحانی وجود کے ساتھ اپنے تخلیقی گھوڑے کی پیٹھ پر اپنے مادی وجود کے ساتھ سوار ہیں اور انتہائی خاموشی اور سکون کے ساتھ اس کہانی کی طرف بڑھتی جا رہی ہیں جو ابھی معدوم نہیں ہوئی۔

زندگی کی تخلیق اور اس کے مادی اور روحانی وجود کی گہرائیوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان یا خود روشن ہو جائے یا اس زندگی کو تخلیق کرنے والے عظیم تخلیق کار کی روشنی کو اپنے روحانی وجود سے منعکس کرے۔ خود روشن ہونے اور اپنے شفاف وجود سے تخلیق کار اور تخلیق کی روشنی کو منعکس کرنے کے لیے خود اور خودی کے روحانی وجود کی گہرائیوں میں تیرنے کے ساتھ ساتھ مادی وجود کو وسعتوں کی حدوں سے باہر لے جانا پڑتا ہے۔ درحقیقت مادی

محمد ازرم

حدود کو پار کرنا ہی خود سے خودی تک کا سفر ہے۔
سیمیں کرن بھی ان چند ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے تخلیق کو سمجھنے کے اپنے ہونے کو تخلیق کا ایک مرکزی نقطہ سمجھ کر اپنی حدود اور اپنے تخلیقی ہنر کو تخلیق کی آخری حدود تک پھیلانے کی کوشش کر رہی ہیں۔
سیمیں کرن تخلیق کے مادی اور روحانی پینڈولم کی طرح اپنے تخلیقی اور ادبی ہنر میں مادی اور روحانی وجود کی آخری حدوں کو یک وقت چھونے کی کوشش کرتی ہیں۔ مادی اور روحانی وجود کی کشمکش میں تخلیقی ہنر آزمانا آسان کام نہیں، مادی وجود سے روحانی وجود تک ایک لمحہ سفر کرنے کے لیے سالوں کی انتھک ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔
اس ریاضت میں سب سے پہلے خود کو سمجھنا پڑتا ہے پھر زندگی کو۔ اس کے بعد زندگی سے جڑی ان سبھی اکائیوں اور اصولوں سمجھنا ضروری ہوتا ہے جو زندگی کو تخلیق کرتے پھر اس کے وجود کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔
سیمیں کرن جب ناول لکھتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ سیمیں کرن ہزاروں سال زندگی جی ہوئی ایک بوڑھی عورت کی ایک روح ہے جو اپنی زندگی کے تمام تجربات اپنے ناول میں لکھ رہی ہیں۔ جب سیمیں کرن کا کوئی افسانہ پڑھو تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ زمین سے دور کسی دوسرے سیارے پر بیٹھ کر زمین پر گزرتے حالات کو تحریر کر رہی ہیں اور جب ان کی نظمیں پڑھیں تو یہ محسوس ہوتا ہے سیمیں کرن ایک معصوم سی لڑکی ہیں جو نظمیں لکھتی ہیں۔ میں جب بھی سیمیں کرن کی تخلیق کی گئی کوئی تحریر پڑھتا ہوں تو میں ان کی لکھے گئے موضوع پر گرفت اور اس کو بیان کرنے یکتا ہنر کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں؛ چاہے وہ تحریر ایک چھوٹی سی معصوم نظم ہو یا ''ایک معدوم کہانی'' جیسا ایک پیچیدہ اور گہرا ناول ہو۔
سیمیں کرن کی گرفت زندگی سے جڑے ہر موضوع پر مضبوط ہے۔ کالم، مضمون، تبصرے، نظم، افسانہ اور ناول غرضیکہ انھوں نے اپنے تخلیقی اور ادبی ہنر کو ہر ادبی اور تخلیقی صنف میں آزمایا اور بہترین طریقے سے آزمایا۔ اور بہت ہی کم وقت میں ادبی دنیا میں وہ مقام حاصل کر لیا جس کا لوگ خواب دیکھتے ہیں۔ سیمیں کرن کی جو تصانیف میری نظر سے گزری ہیں ان میں ''ایک معدوم کہانی'' (ناول) اور مربعوں کی دائرہ کہانی (افسانے) میرے پسندیدہ ترین کتابیں ہیں۔
اس کے علاوہ ان کی نمایاں تصانیف میں ''خوشبو ہے تو بکھر جائے گی'' (ناول)، ''شجر ممنوعہ کے تین پتے'' (افسانے)، بات کہی نہ گئی شامل ہے۔ بلاشبہ سیمیں کرن اردو ادب میں موجودہ دور کی ایک بہترین ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں جو اپنے تخلیقی و ادبی ہنر اور تحریروں سے زندگی اور تخلیق کو آنے والی کئی صدیوں تک روشن رکھیں گی۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر سید اظہار الحسن بخاری کی یادوں کے چراغ

پروفیسر سید اظہار الحسن بخاری ایک نامور معلم اور کامیاب منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش کردار اور خوش گفتار شخصیت کے مالک ہیں۔ اعلیٰ اقدار کے حامل سید اظہار الحسن بخاری سراپا محبت و اخلاص ہیں۔

ان کی کتاب " اجالے اپنی یادوں کے" کئی حوالوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب یادداشتوں کا مجموعہ ہے جس میں ان کی نجی، معاشرتی اور پیشہ ورانہ زندگی کی یادیں اور ان یادوں کے خوش نما رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔

مشاہدات، محسوسات اور نظریات کو سچائی اور دیانتداری کے ساتھ قلم بند کرنا ایک مشکل کام ہے لیکن انھوں نے اس کتاب میں اپنی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کو پوری دیانتداری اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کر کے اس مشکل کام کو سہل بنا لیا۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کا انداز بیان بھی سچا، پاکیزہ اور شائستہ ہے۔

سید اظہار الحسن بخاری ان اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے شعبۂ تدریس کا انتخاب محض حصول معاش کے لیے نہیں کیا بل کہ درس و تدریس اور علم و ادب سے ان کی گہری محبت نے انھیں اس کام پر مامور کیا۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے سب سے زیادہ خوش کن پہچان ایک استاد ہونا ہے، وہ اس پہچان پر فخر کرتے ہیں۔ بحیثیت استاد انھوں نے اپنا کردار محض کلاس روم تک محدود نہیں رکھا۔ تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ کالج کے مالی معاملات پر گہری نظر رکھنا، دفتری امور کی گتھیاں سلجھانا، انگریزی میں بھاری بھرکم مراسلے تحریر کرنا، ادارے کی تعمیر و ترقی کے لیے دن رات کوشاں رہنا، کالج میگزین کو ابتدائی مراحل سے لے کر پرنٹنگ پریس سے وصولی تک اپنی نگرانی میں سنوارنا اور اپنے رفقا کی مدد کے لیے ہر دم تیار رہنا ان کی ہمہ جہت شخصیت کے روشن پہلو ہیں۔ جو احباب انھیں ذاتی حیثیت میں جانتے ہیں میری اس بات کی تائید کریں گے کہ پروفیسر بخاری نے ان گنت نوجوانوں کو روشن مستقبل تک پہنچنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ایک عمر اسلام آباد کی تعلیمی و تدریسی فضا کا حصہ رہنے کی وجہ سے ان کے پاس اس شعبے سے متعلق

غیور حسین

مشاہدات، تجربات اور معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ ایچ ٹائن کالج ان کی یادداشتوں میں محض ایک درسگاہ نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا کردار دکھائی دیتا ہے جس سے ان کی بے پناہ محبت ان کی خوبصورت ترین یادوں کا محور و مرکز ہے۔ یہ وہ درسگاہ ہے جہاں وہ ایک طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے اور پھر یہیں ایک استاد کے طور پر تعینات ہوئے، کامرانی کی یہ داستان یہاں ختم نہیں ہوئی کیونکہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اظہار الحسن بخاری صاحب اس ادارے کے پرنسپل تھے۔

اس کتاب کا ایک کثیر حصہ شعبہ تدریس سے وابستہ یادوں کی بازگشت ہے۔ اسی لیے پروفیسر احسان اکبر نے بجا کہا کہ یہ کتاب ''تدریس نامہ'' ہے۔ گویا ان کی زندگی اور تدریس ایک ہی سفر کے دو نام ہیں۔

ماضی کو یاد کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ماضی انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھی ہوا کرتا ہے۔ اس سے وابستگی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتی چلی جاتی ہے اور کبھی کوئی یاد آنکھوں کو نم کر دیتی ہے۔ ان یادداشتوں میں بخاری صاحب نے ایسی سبھی کیفیتوں کو انتہائی خوبصورتی اور سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ احباب کے خاکے اور سرزمین حجاز کا سفر اس کتاب کے خوب صورت ترین گوشے ہیں جہاں ان کے اظہار کی سچائی، خلوص اور تاثیر قاری کو بے پناہ متاثر کرتی ہے۔

میرے لیے اس کتاب میں دلچسپی کی ایک وجہ بہت سی خوبصورت شخصیات سے ملاقات بھی ہے۔ کبھی میں ان کے والد محترم سے ملتا ہوں جن کی علمی و روحانی شخصیت مرعوب کر دیتی ہے۔ کبھی پروفیسر ریاست عباسی مرحوم سے ملاقات ہوتی ہے، کہیں دوستوں کی محفل جمائے، احمد جاوید مرحوم دکھائی دیتے ہیں۔ کمیونٹی سینٹر جاتا ہوں تو ڈاکٹر اعجاز حنیف (مرحوم) ''فکری تحریک'' کی نشست سجائے نظر آتے ہیں۔ کہیں پروفیسر نعیم ڈار اور پروفیسر عبدالخالق (مرحوم) کسی مہم پر جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی موڑ پر پروفیسر قمر سلطان مرحوم زندہ دلی سے ملتے ہیں اور پھر اچانک کسی خوابناک راہگزر پہ ایک پرکشش اور خوش لباس شخص میرا راستہ روک لیتا ہے، ہونٹوں پہ مسکراہٹ سجائے، دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ ''پروفیسر حسن عظیم درک! یاد'' تمہیں (مرحوم) لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپنے لگے ہیں۔''

زندگی کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے نہ تو وہ کسی ماورائی صفات کے حامل کسی آئیڈل ہیرو کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی بے باکی کی ان دنیاؤں میں جا پہنچتے ہیں کہ شخصیت تنازعات کی زد میں آجائے۔ یہ توازن، یہ سلیقہ اور یہ تہذیبی شائستگی ان کی زندگی کا سچا عکس ہے۔

بخاری صاحب نے جن جزئیات کے ساتھ مختلف واقعات اور کرداروں کا ذکر کیا، وہ یقیناً ایک وصف ہے۔ یادوں کے یہ روشن چراغ قاری کو اپنی جانب کھینچتے ہیں لیکن اس سے بڑھ کر انہوں نے اپنے عہد کی تاریخ، تہذیب، ثقافت، علمی و تدریسی ماحول اور سماجی رویوں کی مختلف صورتوں کو اس دل کشی سے پرویا ہے کہ یہ کتاب محض ایک انسان کی یادداشتوں تک محدود نہیں رہتی بل کہ ایک عہد کی ایک اہم دستاویز بن جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

سونا مرجانا ___ پنجاب کے گمشدہ کردار (بہروپیا)

سونا مرجانا، تیس بتیس سال کا کلین شیو خوبرو شخص ہے - لمبا قد، مناسب بدن، ہلکے بھورے رنگ کی آنکھیں قدرتی ہلکے سنہری بال، اور لچھے دار گفتگو ان سب خوبیوں کے ساتھ اس کو عورت کا روپ دھارنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوتی- یوں تو یہ خدوخال اور چال ڈھال کی کمی بیشی کے ساتھ ہر روپ دھار لیتا ہے اور دن میں کئی کئی روپ دھارتا ہے، کبھی جوان عورت، کبھی کمزور بوڑھا، کبھی پاگل، کبھی شدید زخمی، کبھی کسی گلی محلے اور سڑک کے کنارے پڑی ہوئی لاش اور کبھی فقیر کبھی پیر بزرگ- یہ اپنے ہر روپ کو ایک مشن کا نام دیتا ہے، اور بھرپور دھوکا دہی کے بعد خوب ہنستا ہے اور ہنسی روک روک کر کہتا ہے،

کیوں فیر مزا آیا ناں، تُسی مینوں کی سمجھیا سی یار

میں سونا مرجانا آں سونا مرجانا- اس کے مختلف بہروپ لوگوں کو پریشان بھی کرتے ہیں اور خوش بھی کبھی کبھی لوگ شدید ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں مگر یہ کسی کی خوشی اور ناراضگی کی پروا کیے بغیر اپنے مشن کی کامیابی پر خوب ہنستا ہے اور اپنے مذاق کی قیمت بھی وصول کرتا ہے، سونا مرجانا، دریائے راوی اور بارونق شہری آبادی کو تقسیم کرتی ہوئی بڑی سڑک بند روڈ کے کنارے ایک کچی آبادی میں رہتا ہے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی بیوی بچے کسی گاؤں میں رہتے ہیں اور یہ یہاں بہروپیا بن کر لوگوں سے پیسے بٹورتا ہے جبکہ سونا مرجانا کا کہنا ہے کہ وہ اداکار ہے اور ہیرو بننے کے لیے لاہور آیا تھا، مگر پیسے کی کمی اور عزت کی زیادتی کی وجہ سے بہروپیا بن گیا کہ ''شوق دا کوئی مُل نہیں'' سونا مرجانا کا اصل نام کیا ہے یہ کسی معلوم نہیں، ہر چھوٹا بڑا اس کو سونا مرجانا ہی کہتا ہے اگر کوئی محبت میں اس کو صرف سونا کہہ دے تو یہ پورا زور لگا کر کہتا ہے، مرجانا وی بولو، مرجانا،

یہ اکثر گلی محلے میں لگے تبوقات سے شادی والے گھر کی حیثیت کا اندازہ لگاتا ہے پھر گھر والوں کے مزاج کے مطابق اپنا مشن مکمل کرتا ہے، ایک بار اس نے ایک مذہبی گھرانے کی شادی میں برقعہ پہن کر شرکت کی اور عین نکاح کے وقت شور مچا دیا کہ میں دولہا کی پہلی بیوی ہوں اس موقع پر اس نے آواز حرکات و

اعجاز رضوی

سکنات اور صحیح سیاپا ڈالنے والی عورت کی ایسی نقل کی کہ ایک بار تو مولوی کے ساتھ ساتھ تبوقات بھی کانپ اُٹھے۔ دولہا کا رنگ زرد ہوگیا اور وہ، جو چہرے پر لٹکے سہرے کی ایک لڑی اُٹھا کر شرما شرما کر منہ پر رومال رکھ کر بات کر رہا تھا یکدم سہرا اور کلاہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر روتی صورت کے ساتھ گھر والوں کو یقین دلا رہا تھا کہ یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے لڑکی والوں نے کچھ دیر اس صورت حال کو دیکھا پھر لڑکی کے ماموں صاحب نے بہت غصے میں لوگوں کو خاموش رہنے اور بیٹھنے کا مشورہ دیا۔ خاموش ہونے پر وہ مخاطب ہوئے، بی بی توں آرام نال گل دس، سونا مرجانا جو اندر ہی اندر اپنے اس مشن سے خوف زدہ تھا۔ خالص نسوانی آواز میں مخاطب ہوا۔ میں صحیح گل نئیں دسنی تسی پہلے وعدہ کرو مینوں انصاف دیو گے۔ نالے پنج سو روپیہ میری تلی تے رکھو، دولہا کے باپ نے یہ موقعہ غنیمت جانا اور گھبرا کر فوراً پانچ سو روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے اب سونا مرجانا اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا، اور ہنستے ہنستے بول پڑا، میں سونا مرجانا کیوں فیر مزا آیا، مزا آیا کی آواز پہچانتے ہوئے تبوقات میں کچھ ہلچل ہوئی اور آہستہ آہستہ ہنسی کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یوں پہلے دولہا کے باپ نے نعرہ لگایا، الو۔ دا۔ پٹھا۔

جواب میں سونا مرجانا مخاطب ہوا، زندہ باد نالے شاد باغ سونا مرجانا کا یہ کہنا تھا کہ سُسر ماموں چچا خالو سب ہنسنے لگے۔ دولہا نے بھی روتی صورت کے ساتھ، ہنسنا شروع کیا۔ اور باپ سے مخاطب ہوا، ابا جی، میں اس نوں جانو مار دینا اے، دولہا کا غصہ دیکھ کر اس کے باپ کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ یوں سونا مرجانا، پانچ سو روپے لے کر اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک کے ساتھ ادائیں دکھاتا ہوا پنڈال سے باہر نکل گیا، سونا مرجانا جب کچھ نہیں کرتا اور کسی بھی روپ میں نہیں ہوتا تب بھی بہروپیا ہی لگتا ہے یہ اکثر چست رنگین کُرتا پہنتا ہے کُرتے کے ساتھ شلوار اور کبھی کبھی دھوتی پہننا اس کو پسند ہے۔ لوگوں نے آج تک اس کو ایک جیسے رنگ میں اور ایک جیسے شلوار قمیض میں نہیں دیکھا۔

یہ اپنے ایک کمرے کے گھر کو ہجرہ مرجانا مقیم کہتا ہے۔ اس کے ہجرہ مرجانا مقیم میں ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک چارپائی بچھی ہے اور چارپائی کے نیچے ایک بڑا سا صندوق رکھا ہے صندوق میں ماسک میک اَپ کا سامان ڈاڑھی مونچھ بڑے خوبصورت بالوں کی زنانہ، مردانہ وگ کالے، سرخ و پیلے رنگ کے ڈبے، ایک طرف لکڑی کے ڈبے میں مردانہ زنانہ جوتے چپل رکھے ہیں، دیوار پر جگہ جگہ کیلیں ٹھوک کر کپڑے لٹکانے کا بندوبست کیا گیا ہے ان کپڑوں میں عورت پہلوان فقیر پاگل جن بھوت چودھری اور لاش کے علاوہ بھی بہت سے لباس لٹکے ہوئے ہیں۔ سونا مرجانا نے یہ سب کچھ کیسے اور کتنے عرصے میں جمع کیا اس کے بارے میں خود سونا مرجانا

کا کہنا ہے کہ یہ سب اس نے ہیروگری کے چکر میں فلم اسٹوڈیو میں کام کر کے جمع کیا ہے، کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ سارا سامان چوری کا ہے جبکہ سونا مرجانا کہتا ہے رزق کمان دا سامان میری محنت ویکھو کہ اللہ پاک نے دتا اے۔ سونا مرجانا اپنے ہجرہ مرجانا مقیم میں کسی کو نہیں آنے دیتا ہر شخص کے لیے اس کا کہنا ہے بندے دی یاری بار و بار تے رب دی یاری دل دے نال''

سونا مرجانا اپنا ہر مشن ایک دن پہلے سوچتا ہے اور یونہی بیٹھے بیٹھے اس مشن پر عمل بھی کر گزرتا ہے۔ ایک دن سونا مرجانا نے قبرستان کے باہر قدرے اندھیری جگہ پر بھوت بن کر بیٹھنے کا پروگرام بنایا، اتفاقاً اسی دن ایک جنازہ آ گیا، کچھ لوگ جنازے سے آگے گیس کا لیمپ لیے چل رہے تھے کچھ لوگ جنازے کے پیچھے چل رہے ہیں، ابھی جنازہ اندھیری جگہ سے گزر ہی رہا تھا کہ سونا مرجانا نے یکدم مکمل بھوت کے روپ میں ایک قبر کے پیچھے سے چھلانگ لگائی، لوگ جو کلمہ شہادت کا ورد کر رہے تھے، یکدم جنازہ چھوڑ کر یوں بھاگے کے کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا، سونا مرجانا پہلے تو مشن کی کامیابی پر خوش ہوا مگر فوراً ہی سمجھ گیا کے آج کے مشن پر صرف مار پڑے گی۔ اس لیے فوراً ایک قبر کے پیچھے چھپ کر بھوت کا لباس اتارا منہ صاف کیا اور خود میت کے پاس آ گیا اور کلمہ شہادت کلمہ شہادت کا ورد کرنے لگا، اتنے میں کئی لوگ اس کے نزدیک آئے وہ مخاطب ہوا۔ اے الو دا پٹھا سونا مرجانا ہی ہووے گا آ جاؤ آ جاؤ۔ لوگ میت کو دفنانے کے بعد جب گھر لوٹے تو سونا مرجانا بھی ساتھ ساتھ تھا اور بڑے غصہ سے کہہ رہا تھا، اے کوئی مذاق دا ویلہ اے، میں آپ بڑا الو دا پٹھا آں پر اے کم تے نئیں کرسکدا ناں، کیوں جی، تمام لوگ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ اور سونا مرجانا کسی نئے مشن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

سونا مرجانا، اپنے ہر مشن کے پیسے وصول کرنا اپنا حق سمجھتا ہے مگر بچوں کی خوشی کے لیے مونگی جمپ لگانا، اور بچوں کو ہنستا ہوا دیکھ کر زور زور سے رونا اور پھر آنسو صاف کرتے ہوئے کہنا، یار بچو میں سونا مرجانا، دسو فیر مزا آیا ناں، مزا آیا ناں کہنے کے موقعہ پر اگر کوئی سونا مرجانا کو پیسے دینے کی کوشش کرے تو یہ ناراضگی کا اظہار کرتا ہے اور پھر مخاطب ہوتا ہے۔ نانا نا، میں اس کم دے پیسے نہیں لینے، پیسے والے کم ہور بڑے نیں۔

اے مانگی جمپ فری اے فری بالکل فری۔

ایک دن سونا مرجانا اپنے گھر سے نکلا تو یوں لگا، کوئی بہت کرامت والا بزرگ آ رہا ہے، کچھ لوگ اس کو دیکھ کر حیران ہوئے اور کچھ نے پیر صاحب پیر صاحب کی رٹ لگا کر خلقت کو جمع کر لیا۔ پیر صاحب نے انگلی آسمان کی طرف بلند کی، اور ایک نعرہ حق بلند کرتے ہوئے مخاطب ہوئے، اس کچی بستی دا بُرا حال اے، پانی دا مسلہ اے، کئی گھر اولاد کی نعمت سے محروم ہیں، کئی گھر نافرمان اولاد دی وجہ توں پریشان نیں، کسی کو روزگار کا مسئلہ ہے، کسی کی شادی نہیں ہو رہی، کیوں یہ سب ہے

ناں، او بولو وی، وہاں موجود ہر شخص نے ہاں میں گردن ہلائی تو پیر صاحب نے پھر حق کا نعرہ لگایا اور بولے، لاؤ کچھ اللہ کے نام پر صدقہ خیرات دو، میں یہ مسئلے حل کرتا ہوں، پہلے تو لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر کچھ خواتین نے پہل کی اور کچھ پیسے پیر صاحب کی خدمت میں پیش کیے، پھر کیا تھا لوگوں نے اپنی اپنی مرادوں کو سوچتے ہوئے پیر صاحب کے سامنے نذرانے کا ڈھیر لگا دیا، پیر صاحب نے لوگوں کے دل و دماغ میں چھپی ہوئی ہر مراد کو اُونچی آواز میں دہرایا، ہاتھ بلند کیے دعا کی، اور اپنے چولے کی بڑی بڑی جیبوں میں نذرانہ منتقل کیا اور دعا دیتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا، لوگ پیر صاحب کی آمد اور ان کے مسائل سننے پر خوش تھے، خود سونا مرجانا، پیر کا مشن پورا ہونے پر بہت خوش تھا، اور وہ اسی خوشی کے عالم میں کہہ بیٹھا کیوں، فیر مزا آیا، سونا مرجانا کا یہ کہنا تھا کہ لوگوں نے پیر صاحب سونا مرجانا پر باقاعدہ حملہ کر دیا اور اس حملے میں خواتین آگے آگے تھیں، جنھوں نے پیر صاحب کو نذرانہ دینے میں پہل کی تھی، سونا مرجانا، اس خطرناک صورتحال میں بھی ہنس رہا تھا مار کھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا، فیر مزا آیا ناں کچھ دیر بعد لوگوں کا غصہ اور دھوکا کھانے کی شرمندگی کم ہوئی تو انھوں نے سونا مرجانا کی تعریفیں شروع کر دیں، سونا مرجانا نے اعلان کیا کہ سب کا نذرانہ واپس کر دے گا، مگر اگلے سال عید کے بعد، پر دعا آج ہی کرے گا، لوگوں نے دعا کا سن کر نذرانہ بھی اس کو بخش دیا، یوں سونا مرجانا، مالا مال ہو کر گھر لوٹا، آج وہ بہت خوش تھا، سو اس نے سوچا، کیوں نا، فوری طور پر کسی پاگل کا روپ دھارا جائے اپنے اس مشن کو پورا کرنے کے لیے اس نے خود ہی خود سے مہلت مانگی، اور شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر مخاطب ہوا - اوے سونا مرجانا، توتے سچی مچی سونا لگدا ایں، چل فیر اج عیاشی ہو جائے، نالے منی آرڈر بھی کرنا اے-

یہ سوچ کر وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا سڑک کنارے چارپائی ہوٹل میں داخل ہوا پھر ٹھنڈا پانی کہہ کر چارپائی پر بیٹھ گیا پھر اپنی مرضی کا کھانا آرڈر کیا، پھر دودھ پتی اور تیز میٹھا کہہ کر چائے کا آرڈر دیا، اور چارپائی پر دونوں پاؤں پھیلا کر ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بلند کر لیں، اور سوچا کبھی چودھری کا کردار بھی کیا جائے، مگر پھر یہ سوچ کر اس مشن کو چھوڑ دیا کہ چودھری کا مشن پورا کرنے کے لیے لوگوں کو گالیاں دینا اور جوتے مارنا اور دھکے دیئے بغیر تو یہ مشن پورا نہیں ہوگا، سو اس نے اس خیال کو رد کر دیا پھر سوچا کے مسافر کا مشن کیا جائے، مگر اس میں بھی اس کو بھوکے پیاسے گھر سے نکلنا میلوں پیدل چلنا پھر بڑی سڑک سے بس میں بیٹھنا ایک مشکل کام لگا سو اس نے یہ مشن بھی ترک کر دیا-

اور کچھ وقت تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر اچانک اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، لڑکا کھانا لیے کھڑا تھا، اس نے چارپائی پر پیر سمیٹے

اور کھانا رکھنے کا اشارہ کیا پھر ٹھنڈے پانی سے منہ پر چھینٹے مارے اور آستین سے منہ صاف کرتے ہوئے کھانا شروع کیا، پھر چائے پی، اور چارپائی سے اُٹھتے ہوئے ایک انگڑائی لیتے ہوئے مخاطب ہوا، لے بھئی سونا مرجانا، اج، پاگل بن جا، پھر پاگل والی حرکات کرتا ہوا، ہجرہ سونا مرجانا مقیم میں آ گیا، کچھ دیر، سوچتا رہا، پھر سر پر پٹی باندھی، پرانا میلا کُرتا پہنا، گریباں چاک کیا، پرانی رنگ اڑی دھوتی باندھی، پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل پہنی، منہ پر ایک نقلی سیاہ مونگا لگایا، اپنے کھلتے ہوئے رنگ کو میک اَپ کے ذریعے میلا بر پر سر، رنگ ڈالا، اور ہاتھ میں ایک اینٹ پکڑ کر گھر سے باہر آ گیا۔ پہلے گلی میں جو بھی نظر آیا، اس نے اس پر اینٹ مارنے کا انداز بناتے ہوئے، اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ یونہی دو چار لوگوں کو ڈراتے ہوئے، اس نے خریداری کرتی ہوئی چند خواتین کو بھی خوف زدہ کیا، پھر بند روڈ پر آ گیا، یہاں چند لوگوں نے اس کو پہچان لیا اور خود ہی پکار اُٹھے۔

کیوں فیر مزا آیا، سونا مرجانا، سمجھ گیا کے قریبی لوگوں نے اس کو پہچان لیا ہے پھر اس نے پاگل پن میں شدت لاتے ہوئے، اپنی قریبی جگہ سے کچھ دور نکل آیا تا کہ کوئی اس کو پہچان نہ سکے، یہاں پر اس نے دو چار پیدل چلتے لوگوں کو ڈرایا پھر خود ہی مخاطب ہوا کیوں فیر مزا آیا، لوگوں نے اس کو لعنت ملامت کی اور کچھ پیسے دے کر جان چھڑائی۔

پاگل کی اداکاری کرتے کرتے، سونا مرجانا نے تیز رفتار گاڑیوں کے سامنے آ کر اینٹ مارنے کا طریقہ اختیار کیا، کچھ گاڑیوں نے اسپیڈ آہستہ کی، اور سونا مرجانا کی سلامی کے جواب میں کچھ پیسے دیئے، سونا مرجانا اپنی کامیاب اداکاری پر بہت خوش تھا، اور یہ سوچ کر زیادہ پُرجوش ہو رہا تھا کہ لوگ اس کو پاگل سمجھ رہے ہیں۔ یہ سوچتے سوچتے سونا مرجانا نے ایک تیز رفتار گاڑی کے سامنے آ کر، اینٹ مارنے کا انداز اپنایا تو گاڑی والا گھبرا گیا اور اُسی گھبراہٹ میں اس نے سونا مرجانا کو بچانے کے لیے ذرا کٹ مارنے کی کوشش کی مگر اسپیڈ تیز ہونے کی وجہ سے گاڑی سونا مرجانا سے پوری شدت کے ساتھ ٹکرائی، سونا مرجانا، گاڑی کی ٹکر کھا کر ابھی سنبھلا ہی تھا کہ ایک اور گاڑی سے ٹکرا کر دور جا گرا، گاڑی والے خوف زدہ ہو کر کچھ دیر رُکے اور پھر موقعہ واردات سے بھاگ گئے۔

سونا مرجانا سڑک کے کنارے شدید زخمی حالت میں تڑپتا رہا، کچھ لوگوں نے اس کو دیکھا بھی، مگر ہنستے ہوئے گزر گئے، بل کہ کچھ لوگوں نے تو کیوں فیر مزا آیا والا فقرہ بھی دہرایا، یہاں سے گزرتے ہوئے لوگ اب بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ ہجرہ سونا مرجانا مقیم والا سونا مرجانا، ابھی کھڑا ہو گا اور کہے گا کیوں فیر مزا آیا،

مگر آج سونا مرجانا ہر مزے سے دور ہو گیا تھا مگر لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ بہروپیا سونا مرجانا ہے، مگر سونا مرجانا بہت سے بہروپ بھر کر اب اپنے اصلی روپ کی طرف آ چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

رودادِ روٹ کینال

ہمیں اسلام آباد آئے ابھی کوئی ایک مہینہ ہوا ہوگا ابھی ہم ایک دوست کے کرائے کے گھر پر رہ رہے تھے اور اتفاق سے اس ہفتے ہم گھر میں اکیلے ہی تھے کیونکہ موصوف دوست اور باقی ساتھی بھی اپنے اپنے گھروں کو گئے ہوئے تھے۔ ہفتہ کا خوشگوار دن تھا صبح ہم کچھ دیر سے اٹھے کیونکہ آفس کی چھٹی تھی اس لیے آرام کرنے کو موقع غنیمت جانا، مگر زندگی میں مکمل سکون میسر ہو جائے تو کیا بات! بس جی کیا بتائیں ابھی ہم نے آرام کرنے کا سوچا ہی تھا کہ ہلکا ہلکا دانت میں درد محسوس ہونے لگا ہم نے زیادہ توجہ نہ دی اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے شام کو ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی چونکہ موسم بہت اچھا تھا، ہم بھی گھر سے انجوائے کرنے کی خاطر نکل پڑے اور ایک دوست کے گھر چلے گئے وہاں ہم نے آلو قیمہ کھا لیا جو ہمارے لیے ایک عذاب سے کم ثابت نہ ہوا اور دانت صاحب نے سیاستدانوں کی طرح یک دم پھر سے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا اور ہمارے ساتھ آنکھ مچولی شروع کر دی اک ٹیس سی اٹھتی تھی اور جگر کے پار یعنی نچلے جبڑے کے پار ہو جاتی تھی اور پھر یہی حالت اتوار کی شام تک رہی اور مغرب کے بعد یہ ٹیس صاحبہ اپنے پورے جوبن کے ساتھ آورد ہوئی اور ایسی وارد ہوئیں کہ بس اللہ کی پناہ، ہر قسم کے پین کلر کھانے کے بعد بھی آرام تو دور کی بات ٹس سے مس نہ ہوئیں بلکہ انھوں نے تو اور آگے بڑھ کے کان اور کنپٹی تک قبضہ مافیا کی طرح اپنا قبضہ جما لیا ہم جب تک برداشت کر سکتے تھے ان کی یہ حرکت برداشت کرتے رہے۔

آخر کار کراچی ڈاکٹر صاحب کو فون کیا تو انھوں نے دوا کا نام بتا کر کہا کہ یہ لیں بس ہم نے جھٹ پٹ جا کر وہ دوا لی اور کھالی اور ساتھ ہی ایک اور پین کلر کھا لیا اور اللہ سے امان مانگتے رہے اور نو بجے ہم بے خواب خیال ہو گئے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ رات تین بجے کے قریب آنکھ کھلی تو کچھ افاقہ محسوس کیا، مگر اب نیند صاحبہ تھی کہ وہ اٹھکیلیاں کرنے لگیں ہزار ہا بار سمجھایا کہ سونے دو صبح آفس جانا ہے مگر بھلا وہ کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ بڑی منتیں کیں تو بالآخر صبح ساڑھے چھ بجے کہیں جا کر وہ ہم پر مہربان ہوئیں ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ قریباً ساڑھے سات بجے موبائل بھائی جان اپنی پوری آب و تاب سے جاگ اٹھے۔ فون سنتے ہی جو ہماری حالت ہوئی نہ پوچھیے اگر ہمیں بھی مغلظات آتی ہوتیں تو شاید ہم بھی اسی وقت اسٹارٹ ہو جاتے مگر اپنی طبیعت اور عزت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بڑے ہی تحمل

خالد جاوید

اور انکساری سے ان سے پوچھا کہ ”بھائی یہ تو بتاؤ یہ صبح ساڑھے سات بجے سکولوں کے علاوہ پاکستان میں کون سا دفتر کھلا ہوتا ہے اور دوسری بات یہ کہ میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔“ جس پر وہ کہنے لگے کہ ”جی سر مجھے معلوم ہے مگر آپ ہیں تو اسی بلڈنگ میں۔“ یہ سن کر تو دل ایسا کھولا کہ شاید پانی بھی کیا کھولتا ہو گا ہم نے بڑی مشکل سے برداشت کرتے ہوئے ان سے کہا کہ آپ وہیں انتظار کریں جب آفس کھلے تو اندر چلے جایئے گا اور ہم بڑی مشکل سے کروٹیں بدلتے ہوئے زبردستی بستر سے اٹھے اور تیار ہو کے آفس پہنچے۔ اس دن بھی رات تک یہی کیفیت رہی اور پین کلر ہی استعمال کرنا پڑی مگر اب ساتھ میں زکام بھی شروع ہو گیا تھا۔ خیر قصہ مختصر اگلے دن صبح اٹھے تو درد ایسا غائب تھا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔

بہرحال صبح آفس گئے اور وہاں سے شام کو ڈینٹل ہسپتال ڈاکٹر کے پاس چلے گئے اب چونکہ ہم میں اس شہر میں نئے تھے راستوں اور گاڑیوں کا علم زیادہ نہیں تھا اس لیے ہمیں جگہ معلوم ہونے کے باوجود صحیح راستہ تلاش کرنے میں کوئی آدھے گھنٹے سے زیادہ لگا۔ اب جب ڈاکٹر کو بتایا کہ پچھلے دنوں ہمارے ساتھ کیا گزری ہے تو انھوں نے خوب اچھی طرح ٹھوک ٹھاک کے دانت کو دیکھا اور کہا کہ اس کا ایکسرے ہو گا؟ ہم نے کہا جی ٹھیک ہے۔ ایکسرے کے بعد محترمہ ڈاکٹر موصوفہ فرمانے لگیں کہ اس کی روٹ کینال ہو گئی، ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا اس دانت میں کیڑا ہے یہ تو اور دانتوں کو بھی خراب کرے گا اور یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیڑا تو کیڑا ہی ہے اب وہ چاہے دانت میں ہو یا دماغ میں..... خیر مرتے کیا نہ کرتے جی، حامی بھر بیٹھے مگر تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی چار پانچ خوبصورت حوریں ہمارے اردگرد جمع ہو گئیں پہلے تو ہم گھبرا گئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحبہ دائیں، ایک بائیں اور ایک سر کے پیچھے اور دو سامنے کھڑی ہوئی پائیں۔ ابھی ہم اسی شش و پنج میں مبتلا تھے کہ ایک ہلکی مترنم سی آواز سنائی دی منہ کھولیں انجکشن لگانا ہے اور ہمارا منہ خود بخود ہی کھلتا چلا گیا۔ انجکشن لگا ہمیں معلوم نہیں ہوا۔

ابھی تک ہماری سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آئی تھی کہ یہ روٹ کینال میں پانچ حوروں کا کیا کام۔ پھر ہمارے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر کام تمام ہو جائے تو بہرحال چار افراد تو اٹھانے والے ہونے ہی چاہئیں شاید پہلے ہی سے ان کا انتظام کر لیا گیا ہے، مگر تھوڑی دیر بعد اندازہ ہوا کہ جو ڈاکٹر صاحب مستقل نقاب لگے ہوئے تھیں اور ساری مہمان نوازیاں یہ خوبی سرانجام دے رہی ہیں وہ جونیئر ہیں۔ سامنے کھڑی ڈاکٹر جوان سب میں زیادہ ہی صحت مند تھیں سینئر ڈاکٹر جو گائیڈ کر رہی تھیں اور باقی سب خدمت گزار ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ نے شاید نقاب اس لیے لگایا ہوا تھا کہ کام خراب ہونے کی صورت میں کہیں ہم ان کو پہچان

نہ لیں اور بعد میں ہم کہیں کوئی حساب کتاب کا تقاضا نہ کر بیٹھیں۔ بائیں طرف کھڑی ہوئی حور صاحبہ دانت سے اٹھنے والی دھول کو ہوا سے کھینچنے والی مشین اور سر کے پیچھے کھڑی ہوئی حور صاحبہ ایکسرے مشین کو آپریٹ کرتی ہیں تو کچھ جان میں جان آئی۔ کوئی آدھے سے پونے گھنٹے روٹ کنال کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ دو دن بعد آیئے گا۔

دو دن کے بعد ہم نے ہسپتال جا کر ڈاکٹر کو بتایا کہ دانت میں درد تو نہیں ہے مگر دوا کی وجہ سے منہ کا ذائقہ بہت خراب ہے۔ ایک بار پھر انھوں نے خوب اچھی طرح ٹھوک بجا کر چیک کیا اور روٹ کینال شروع کر دی۔ اس بار انھوں نے انجکشن نہیں لگایا تھا اور آخری لمحے جو تکلیف ہوئی وہ بڑی بھیانک کہ اک ہلکی سی چیخ ہمارے منہ سے نکلی۔ بس وہیں انھوں نے اپنا ہاتھ روک کر ایک اور ایکسرے کر ڈالا پھر روٹ کینال شروع کی۔ اس دوران جو درد اٹھا تھا وہ ختم ہو گیا۔ انھوں نے پوچھا ''اب درد ہے'' تو ہم نے کہا ''نہیں''۔ پھر دس منٹ کے لیے وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں اور آ کر کہنے لگیں کہ میں کچی فلنگ کر رہی ہوں اور پھر ہنستے ہوئے کہا کہ اب منہ کا ذائقہ خراب نہیں ہوگا۔ خیر دانت کی ڈریسنگ ہو گئی تو ہم نے ڈرتے ڈرتے احتیاطاً اُن سے ان کا نام معلوم کر لیا تاکہ دوبارہ آئیں تو ہمیں یہ تو معلوم ہو کہ ہم کس کے زیرِ عتاب، رہیں میرا مطلب ہے کس کے زیرِ علاج رہے ہیں؟

گھر پہنچتے ہی جو ہمارے دانت میں تکلیف شروع ہوئی وہ نہ پوچھیں۔ صبح سے ویسے ہی بھوکے تھے کھانے سے بھی گئے۔ خیر زبردستی نہ کسی طرح تھوڑا سے دلیہ کھا کر پانی پی کے سونے کے لیے لیٹ گئے مگر درد تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ حفظِ ماتقدم کے تحت ہم نے اُن سے پین کلر بھی لکھوالی تھی۔ وہ دوا کھائی مگر جب کافی دیر تک آرام نہ آیا تو ایک اور پین کلر کھانا پڑی۔ کیونکہ اب انھوں نے ہمیں پانچ چھ دن کے بعد بلایا تھا یہ دو دن تو ہمیں دانت کی تکلیف کی وجہ سے مہنگے پڑے اس کے بعد تکلیف نہ ہوئی۔ اور ان چھٹیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم کشمیر بھی ہو آئے۔ جب ہم نے دوبارہ ڈاکٹر کو بتایا کہ دو دن بہت تکلیف ہوئی ہے تو انھوں نے دوبارہ ایک اور ایکسرے کر ڈالا اور کچھ دیر روٹ کینال کرنے کے بعد کہا اب میں کچی فلنگ کر رہی ہوں اس کے بعد آپ جب چاہیں کیپ لگوا سکتے ہیں مگر کپ چڑھانے کی فیس سن کر ہم نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا کہ اب ہم عمر اس حصے میں اپنے ناکارہ اور بوسیدہ دانتوں پر ہزاروں روپے خرچ نہیں کر سکتے کیونکہ اتنی تو ہماری تنخواہ بھی نہیں ہے اور بالفرض کسی طرح کر بھی لیا تو دو تین مہینوں تک ہم کیا کھائیں گے اور گھر کو کیا بھیجیں گے اس لیے ہم خاموشی سے مزید ادویات لکھوا کر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گھر آ گئے اور اللہ کا شکر ہے کہ اب تک افاقہ ہے۔

☆☆☆☆☆

دل کش و دل نواز ''شاہ'' علی نواز شاہ

علی نواز شاہ سرتا پا ایک ادبی کرشماتی شخصیت ہے یہ بروز جمعہ رات آٹھ بجے یکدم سیکرٹری حلقہ اربابِ ذوق کا روپ دھار لیتا ہے آٹھ بجے سے پہلے پہلے تک یہ گریڈ20 کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے، پھر نیوز اینکر بن کر چاہتا ہے کہ کوئی ایسی خبر سنائے، جس کا نشہ قومی سطح پر تادیر قائم رہے علی نواز شاہ کی مصروفیات مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں۔ یہ رائٹر کس وقت بنتا ہے یہ ایک راز ہے۔ دن رات کی مصروفیت کھانا پینا اور نئے ماڈل کی گاڑی ڈرائیو کرنا اور پھر اتنا نثری کام کرنا اس بات کا گواہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر تخلیقی نثر کا آدمی ہے علی نواز شاہ نے جو لکھا وہ ظاہر اور باطنی دونوں حوالوں سے زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا۔

اس کے ناول کا لک گرد ماں دشت زدہ گرد پتلے اور اب حال ہی میں آنے والا تخلیقی ناول یہوہ، ایسی نثر میں بُنے ہوئے شاہکار ناول ہیں جن کو پڑھنے کے بعد ایک عام قاری خود کو کچھ نہ کچھ پڑھا لکھا محسوس کرتا ہے اور اپنی زندگی میں اِدھر اُدھر کے ظاہر اور پوشیدہ مسائل کو خود ڈھونڈنے اور حل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایک حقیقی رائٹر زندگی کو سمجھتا ہے اس کے ازلی و ابدی ڈرافٹ پر غور کرتا ہے اور عام لوگوں سے ہٹ کر ایک نظریہ ایک فکر اور ایک نتیجے پر پہنچ کر دوسروں کا مددگار بنتا ہے اور صرف کان کے بل پر جینے والی مخلوق عوام کو، وہ سب کچھ دکھا دیتا ہے، سمجھا دیتا ہے جو اس کی سمجھ سے بالا اور ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

علی نواز شاہ کا یہ چلن آج کا نہیں، بل کہ 1990 سے چلا آ رہا ہے جھنگ کا پیدائشی اور رہائشی فیصل آباد سے انگری کلچر انجینئرنگ میں ایم ایس سی کرنے کے بعد جس عمر اور جس رنگ روپ کے ساتھ یہ لاہور آیا اس عمر میں تو یہ جھنگ میں بھی محفوظ نہیں تھا اور یہ بے دھڑک لاہور آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے پی سی ایس کا

اعجاز رضوی

امتحان پاس کیا اور افسر اعلیٰ بن گیا تاکہ چھوٹے موٹے ہتھ چلاکی کرنے والوں سے محفوظ رہ سکے اور پورے گورنمنٹ پروٹوکول کے ساتھ رہے اور زندگی بسر کرے۔

علی نواز شاہ کی بیگم صاحبہ ڈاکٹر ہیں اس لیے اس نے بہت بے فکری سے پورا اندرونی اور بیرونی لاہور دیکھا اور سوچا کہ چھوٹا موٹا لاہوری نزلہ زکام ہو بھی گیا تو فکر کی کوئی بات نہیں کہ ڈاکٹر تو گھر پر ہی موجود ہے۔

لاہور میں بیل بوٹے بیچ کر اپنے جھنگ میں ایک فری ہاسپٹل چلا رہا ہے لاہور میں رہتے ہوئے اس کے تعلقات بہت اعلیٰ نوعیت کے ہیں۔

کھلاڑی لکھاری افسر پروڈیوسر مالی مزدور ہر ایک سے اس کی بے تکلفی ہے مگر یہ کھلاڑی لکھاری افسر پروڈیوسر مالی مزدور کسی سے بھی کسی کی سفارش نہیں کرتا کہ یہ خود محنت اور صلاحیت سے آگے بڑھا ہے اگر آپ سفارش کی ضد کریں تو یہ فوراً فون ملاتا ہے اور بات یوں کرتا ہے، ہیلو ڈیئر کی حال اے، یار اے اپنے یار بیلی نیں، کوئی نوکری شوکری دا رولا اے، تسی دسو کی ہو سکدا اے۔ ٹھیک اے، تسی کرواو کے، پھر فون بند کرتا ہے۔ اور ایک موٹی سی گالی دے کر کہتا ہے، میرے آقا، اے افسر میرا یار اے بڑا ہی کمینہ آدمی اے، میں کہہ دتا اے، پر یقین کرواے کم نہیں ہونا۔ ہور کوئی کم دسو بندہ حاضر اے۔

حالانکہ خود اس کو ذرا سی کھانسی بھی آجائے تو لوگ ہاتھ میں پستول لے کر نکل آتے ہیں کہ دسو علی نواز شاہ نوں کھانسی کیوں آئی اے۔ اس کی یہ عوامی حمایت آج کی نہیں یہ اس وقت سے قائم ہے جب یہ جوڈو اور ریسلنگ کیا کرتا تھا۔ جب یہ رنگ میں داخل ہوتا، تو مخالف اس کے رنگ روپ اور نزاکت کو دیکھتا اور پھر خود بخود رضا کارانہ طور پر چاروں شانے چت، لیٹ جاتا، کہ خربوزہ چھری پر گرے یا چھری خربوزے پر۔ یوں یہ ہر مقابلہ جیت لیتا ہے یہ جوڈو اور ریسلنگ ہی نہیں بیڈمنٹن میں بھی کئی انٹرنیشنل چیمپئن شپ بھگتا چکا ہے، مگر سادگی ایسی ہے کہ دیکھ کر لگتا ہے لوڈو کھیلنے والوں میں اپنی باری کا انتظار کر رہا ہے جوڈو کراٹے کی لت اس کو فرحت عباس شاہ نے ڈالی تھی۔ کہ یہ فرحت عباس شاہ کا شیدائی ہے اور کبھی کبھی لگتا ہے فدائی ہے مگر دراصل یہ شیدائی ہے نہ فدائی ہے یہ فرحت عباس شاہ کی دائی ہے اس کے پیٹ میں کیا چل رہا ہے، یہ علی نواز شاہ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔

مرشد، آقا، بھائی جان یہ لفظ علی نواز شاہ عام طور پر بولتا ہے۔ اپنی بات سمجھانے اور بات سمجھنے تک تو مرشد، آقا، بھائی جان اپنے جگہ پر ہوتے ہیں مگر جب یہ اپنے موقف پر ڈٹ جائے تو پھر یہ سارے القاب کسی ماڑے مرید کی طرح لگنے لگتے ہیں۔

علی نواز شاہ سے منیر نیازی کا بہت پیار تھا اور نیازی صاحب اس کو علی کہہ کر مخاطب کرتے تھے، مگر شام کے بعد اس علی کے ساتھ یا کا اضافہ بھی کر لیتے تھے کہ شام کے بعد جو منیر نیازی کا مددگار رہتا وہی مشکل کشا بھی شمار ہوتا تھا۔

علی نواز شاہ برسوں سے پی ٹی وی پر شام کی خبریں پڑھ رہا ہے اور اکثر خبریں پڑھنے کے بعد ہی 'ٹی ہاؤس' آتا ہے، اگر وہاں آکر تنقیدی اجلاس میں

شامل ہوتو یوں دونوں ہاتھ زانو پر رکھ کر سامنے دیکھتے ہوئے مخاطب ہوتا ہے کہ لگتا ہے خبریں پڑھ رہا ہے۔ پھر یوں بولتا ہے کہ بھائی جاوید قاسم یہاں سے انتقال کر گئے۔ کیوں کہ انھیں کہیں اور جانا تھا، اور جانا بھی ہولی ہولی تھا آج سردی کی شدت بہت زیادہ ہے اس لیے یہاں لوگوں کی حاضری کم ہے، یا پھر غزل نظم کی کاپی اٹھا کر ایسا بھرپور تبصرہ کرتا ہے کہ لوگ حیران ہو جاتے ہیں کہ بغیر پڑھے ہی بس شاعر کو دیکھ کر ہی تنقید کر دی۔ یہ سب بات سمجھنے کا ہنر ہے جو علی نواز شاہ کا خاصا ہے۔ علی نواز شاہ کو خبریں پڑھنا اچھا لگتا ہے کہ اس مخبری سے پہلے گورنمنٹ میک اپ کی سہولت فراہم کرتی ہے جو اس کا دل پسند مشغلہ ہے، میک اپ سوٹ بوٹ کے ساتھ جب کوئی خوش رنگ ٹائی لگا کر یہ سیدھا ''پاک ٹی ہاؤس'' آتا تو اتنی جلد بازی کے انداز میں اندر داخل ہوتا ہے کہ دیکھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ یہ انگریز کا بچہ کسی پاکستانی بچے کے پیچھے آیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب یہ ''ٹی ہاؤس'' میں ادبی تنظیم سخنور اور لوگ کے اجلاس کیا کرتا تھا، اور تنظیم کا ہر عہدہ خود اس کے پاس رکھتا کہ یہ فرحت عباس شاہ کے علاوہ کسی پر ادبی اعتبار نہیں کرتا۔ اس زمانے میں اس کی آمد پر باہر ریگنگ کے پاس بیٹھا بوٹ پالش کرنے والا کہتا

بھائی ادھر ادبی حلقہ نہیں چلتا

اُدھر کوئی چکر چلتا ہے

اتنے چھوٹے اور پیارے بچے کو افسانے کا لالچ دے کر کون خراب کرتا ہے، ہم اس کا پتہ لگائے گا۔

اور وہ آج تک پتہ نہیں لگا سکا مگر علی نواز شاہ کا انداز وہی ہے۔ علی نواز شاہ کا رنگ روپ ایسا ہے کہ جب بھی جہاں بھی دیکھیں لگتا ہے بیوٹی پارلر سے آ رہا ہے۔

علی نواز شاہ کا ہاتھ جوڑ کر یہ کہنا کہ مرشد آقا بھائی جان تُسی ہر ادیب شاعر نوں جاندے او، بھائی جان تُسی حضرت نوح دے زمانے دے ادیب بندے او، حالانکہ یہ خود حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ سخنور کے اجلاس کیا کرتا تھا، اب یہ ہمیں آدم ثانی کہہ رہا ہے، فرحت عباس شاہ فیصل زمان چشتی، شفیق احمد خان اور خود میں حضرت نوح کے ملاح ہیں، اور حلقہ ارباب ذوق کشتیٔ نوح ہے جو پانی کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ بہتی ہے۔

یہ ہر بات پر جی جی کرتا ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ بہت تابع دار ہے بل کہ اس کی اصل وجہ جوہر ٹاؤن کی جی مارکیٹ ہے، جہاں سے گزرتے ہوئے یہ ہر طرف نظر ڈورا تا ہے اور خوب صورت چہروں کو دیکھ کر جی جی کہتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ یہ بچپن میں لمبی قمیض پہنتا تھا، اس لیے بڑا ہوتے ہی اس نے شوق شوق میں پینٹ پہننی شروع کر دی تا کہ قمیض اندر کی جا سکے۔

پھر اپنی کمر کی نزاکت کو چھپانے کے لیے اس نے پینٹ سے ملتا جلتا، کوٹ پہننا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ شوق ایک بڑے برینڈ کے سوٹ پر آ کر ختم ہوا۔

ویسے یہ لوگوں کو یہ ہر لباس میں اچھا لگتا ہے، کہ یہ دل کش و دل نواز تو ہے ہی، بڑا رائٹر بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

غزل

خالد احمد

رگ رگ ایک تصور ایک امنگ بھرے
اک خوشبو پھولوں میں کیا کیا رنگ بھرے

فن کی اپنی موج دکھوں کی اپنی رو
اک ترکش میں کوئی کتنے خدنگ بھرے

کون لکیروں کو تصویروں میں ڈھالے
کس کا لہو یہ خاکے، یہ نیرنگ بھرے

رنگِ لباس کو رنگِ بدن سے آب ملے
گنگ حروف میں نغموں کا آہنگ بھرے

کس کی آنکھیں تہمتِ لمس اٹھائیں گی
بجلی کے تن میں ہیں کس کے رنگ بھرے

پولے پولے پاؤں دھرے پروائی بھی
خاک میں اڑتے رنگ یہ کس کے سنگ بھرے

کاہش کا دریا بھی خواہش کا گھر تھا
پانی بھرنے آئے اور نہنگ بھرے

غزلیں

فلک پہ ہے نظارا روشنی کا
چمک اُٹھا ستارا روشنی کا

لہو اپنا رواں اس میں کیا ہے
تعلّق ہے ہمارا روشنی کا

بڑھایا ہم نے دل کا نور ایسا
اُدھر پانی اتارا روشنی کا

جھلکتی ہے تو چھپ جاتی ہے پہلے
یہ کیسا ہے اشارہ روشنی کا

نگاہوں میں اجالا کر رہا ہے
بہت اونچا منارہ روشنی کا

پڑھوں تو نظم بن جاتا ہے ثاقب
ہر آنسو ہے شمارہ روشنی کا

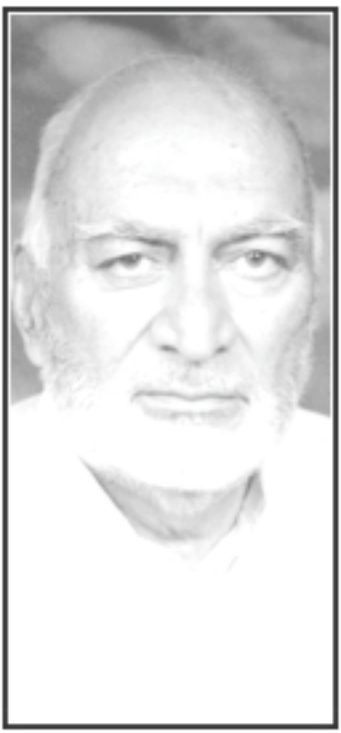

آصف ثاقب

بُرا تھا جو وہ اچھّا ہو گیا ہے
گھروں کا نور زندہ ہو گیا ہے

تمھیں جانا تھا حسنِ گفتگو سے
تمھارا بول بالا ہو گیا ہے

پڑھے ہیں ہم نے دل سے میر و غالب
ہمارا شوق پورا ہو گیا ہے

نہیں لکھنا ہیں اب تعویذ اس کو
ہمارا پیر اندھا ہو گیا ہے

پرانے جاننے والے کہاں ہیں
ہمارے بیچ جھگڑا ہو گیا ہے

بہت اچھا ہوا ہے آج ثاقب
کسی کا عشق رسوا ہو گیا ہے

غزلیں

کمال کیسے، ہنر کیا سے کیا دکھاتی ہے
غزل دماغ کو بھی دل بنا دکھاتی ہے

لہو میں جاگ اٹھے جب چراغ عشق کی لَو
شبوں میں آپ ہوا راستہ دکھاتی ہے

زمانوں بعد جو ہونا ہو، کوئی موجِ خیال
سب اُس کے عکس نگاہوں میں لا دکھاتی ہے

کسی نے میری بصارت پہ کیا فسوں پھونکا
کہ آئنے میں کوئی دوسرا دکھاتی ہے

میں ایسی دانشِ مجہول کا نہیں قائل
جو عشق و جنگ میں سب کچھ روا دکھاتی ہے

نگاہ جب بھی اٹھاتا ہوں آسماں کی طرف
کوئی الگ سا ستارا نیا دکھاتی ہے

تری غزل سرِ آشوب حرف و فن عالی
کسی نواح میں کچھ تو ہرا دکھاتی ہے

جلیل عالی

شاید ذرا سا جان لے رازِ جہان کو
اک دوسرے میں دیکھ زمیں، آسمان کو

رکھا ہے اِس مقامِ یقیں پر گمان کو
جب چاہے لا مکان بنا لیں مکان کو

کشتی اُتارتا ہوں سمندر میں، تو ہَوا
چلتی ہے دیکھ دیکھ رُخِ بادبان کو

سینے میں ایک یاد ہمیشہ جواں رہی
رکھا ہے دُور جس نے زمانے سے دھیان کو

وہ دن بھی تھے کہ دیکھتے تھے دُور دُور تک
طائر تمام رشک سے میری اُڑان کو

بیٹھا ہوا ہے گھات میں کوئی مچان پر
کوئی ہدف بنائے ہوئے ہے مچان کو

کیا جایئے کہ جس کے کہے میں ہے سیلِ وقت
لے جائے کس طرف وہ رُکی داستان کو

عالی خبر نہیں تھی کہ آئے گا ایک دن
اپنا کمالِ عرضِ سخن اپنی جان کو

غزل

ایسے ہی نہیں ذات کے ماحول سے نکلا
میں جاں کے عوض خطۂ انمول سے نکلا

اس وقت سمجھ آئے ضرورت کے معانی
جب آخری سکہ مرے کشکول سے نکلا

دھڑکن میں اداسی تھی کہ نوحہ تھا مگر میں
آنسو کی طرح وادیٔ پرہول سے نکلا

شامل تھی مدد کلمۂ لاحول کی لیکن
خناس تو حالات کی چھتروں سے نکلا

اے صدق یقیں تو نے مری پیاس بجھادی
پانی تو نہیں تھا جو مرے ڈول سے نکلا

تنہائی اسے راس نہ آئی مرے گھر کی
وہ ایک پرندہ تھا کسی غول سے نکلا

اک عمر گنوا دی جسے پانے کی لگن میں
وہ تو نہیں تھا جو ترے خول سے نکلا

ہر لفظ نے دی میری محبت کی گواہی
اک تو ہی مرے گیت کے ہر بول سے نکلا

قائم ہے کنور اس لئے الفاظ کی حرمت
ہر لفظ کسی چھان پھٹک تول سے نکلا

اعجاز کنور راجہ

غزل

کر دیا کیوں آئنہ گر کے سپُرد؟
آئنہ کرنا تھا پتّھر کے سپُرد!

پیاس ہم سہتے رہے کچھ سوچ کر
کر کے اِک دریا سمندر کے سپُرد

کرب جتنا ہے، مری قسمت میں ہے
راحتیں سب اُس کے پیکر کے سپُرد

ساحلوں سے اب ہمیں لینا ہے کیا؟
کشتیاں اپنی سمندر کے سپُرد!

شِدّتِ شوقِ نظارہ کے سبب
آنکھ ہی کر دی ہے منظر کے سپُرد!

ہم ہیں زندہ کس زمانے میں نسیم
بیل پھولوں کی ہے کیکر کے سپُرد!

نسیمِ سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھر وہی مہرباں ہوا آئی
اے مری بے چراغ تنہائی

غزل

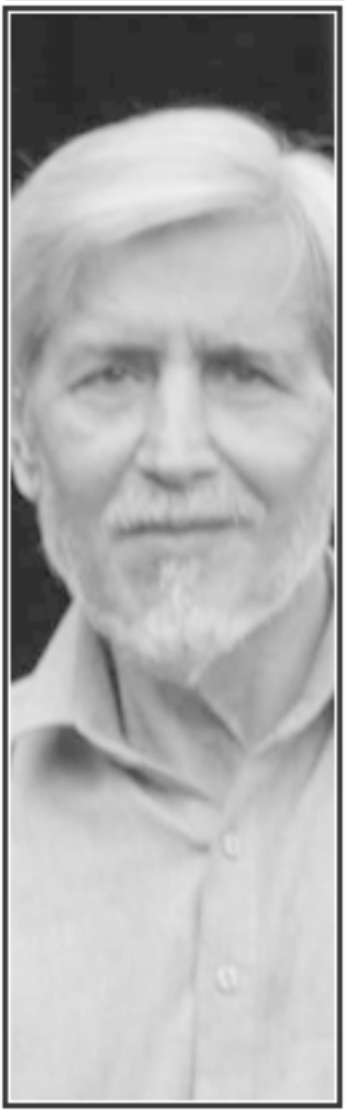

ڈال کر پانی میں کشتی شاد ہونا چاہیے
شرط ہے مانجھی کو ساحل یاد ہونا چاہیے

ہو اگر انسان سچ کے راستے پر گامزن
اس کے لب پر ہر چہ باد اباد ہونا چاہیے

کاٹ کر کہسار جوئے شیر پیدا کر سکے
بندہ شیریں کے لیے فرہاد ہونا چاہیے

چارسُو فرعون کے پَرتَو نظر آنے لگے
اِک نہ اِک موسیٰ کا بھی ہمزاد ہونا چاہیے

کہہ رہے ہیں دیدہ ور کیوں عدلیہ ہوتے ہوئے
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے

فرد کی کھوئی توانائی کو واپس لا سکے
چارجر ایسا بھی اک ایجاد ہونا چاہیے

دہر میں گلزار جو باعث تشدد کا بنے
نام ان افراد کا شدّاد ہونا چاہیے

گلزار بخاری

غزلیں

زیرِ تعمیر ہے دُنیا کے ستائے کا مکاں
ڈھونڈتا پھرتا ہُوں جنت میں کرائے کا مکاں

یوں تو مِلتی ہیں ہزاروں ہی مقلد گاہیں
شہر بھر میں نہیں اِک صاحبِ رائے کا مکاں

اپنی پرچھائیں میں بھی سر نہ چھپائیں لیکن
دھوپ میں دیکھنا پڑ جاتا ہے سائے کا مکاں

اُس کی آنکھوں میں بہت دیر رہے ہیں لیکن
راس آیا نہ کبھی ہم کو پرائے کا مکاں

ہم سے گمناموں کو رہتی ہے یہ حسرت خاور
ہو میسر ہمیں شہرت علی رائے کا مکاں

خاور اعجاز

یونہی آ سکتی تھی باتوں میں روانی یہ کہاں
نہر کی بولی سے مَیں سیکھی ہے دریا کی زباں

عیش و عشرت میں کمیداں ہُوئے ایسے مصروف
طاق نسیاں پہ دھری رہ گئیں شمشیر و سناں

اِس میں ظاہر ہُوئے کچھ تازہ شگوفے تو کھُلا
میرے گلدان پہ تہمت تھی یہ تصویرِ خزاں

مجھے آتا ہے حریفوں کو بھی تالع رکھنا
میرا سکہ ابھی بازار میں چلتا ہے میاں

سب کو معلوم نہیں کوچۂ جاناں کا پتا
کوئی کوئی ہے جسے اذنِ رسائی ہے یہاں

غزل

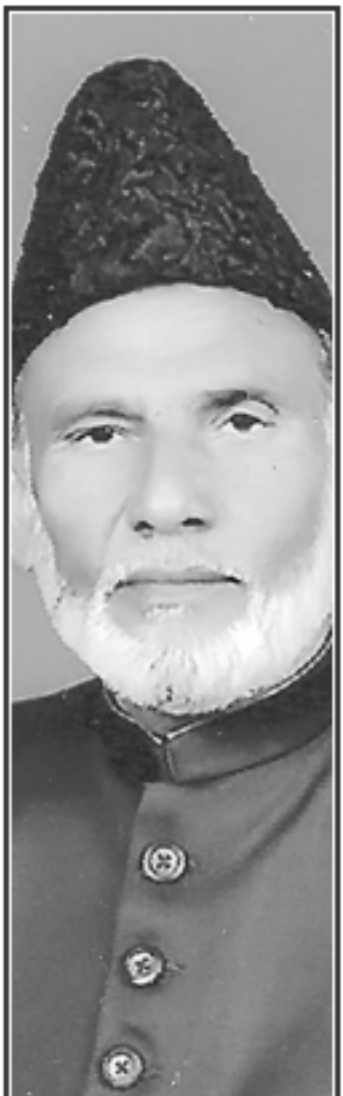

شریف ساجد

نا رسیدہ طرب کا کیا کہیے
گریۂ نیم شب کا کیا کہیے

ہاتھا پائی پہ وہ اُتر آئے
ایسے پاسِ ادب کا کیا کہیے

اپنی وحشت ہے اپنا غم ، اُن کے
خندۂ بے سبب کا کیا کہیے

شیخ رندوں سے بڑھ گئے صاحب
احترامِ نسب کا کیا کہیے

کچھ کہا ہو، ہوا سے لڑنے لگے
بے جہت اس غضب کا کیا کہیے

خود نمائی کو ان کی کیا کہیے
دیدۂ بے ادب کا کیا کہیے

نارسائی بھی رایگانی ہے
جدوجہد و طلب کا کیا کہیے

اب مسیحا مشیر رکھیں گے
ساجدِ جاں بلب کا کیا کہیے

غزل

آنکھ اب تجھ کو میسر ہے نظارا کم کم
ہر تماشا ہے سرِ بزمِ تماشا کم کم

جس طرف جاؤ بہو اِس کی رفاقت میں سدا
موج میں آتا ہے یہ وقت کا دریا کم کم

گرچہ دل میں ہے ابھی سوزِ محبت زندہ
کیوں بھڑکتا ہے تری یاد کا شعلہ کم کم

یہ تو اپنے ہی کسی خواب سرا میں گم تھی
چشمِ حیرت پہ کھُلی رونقِ دنیا کم کم

اس کے ہر داؤ میں اِک داؤ نیا ہوتا ہے
دیکھ! یہ دُنیا ہے، کر اِس کا بھروسا کم کم

سانس میں گھلتا ہے مستی سی جگا جاتا ہے
کسی انجان سی خوشبو کا نشہ سا کم کم

بے نوا عمر فقط آس میں کٹ جاتی ہے
ہاتھ آتا ہے کسی دل کا دلاسا کم کم

شکر کر شکر کہ صدیوں میں کہیں ملتا ہے
زندگی تیری اداؤں کا شناسا کم کم

اُس کا ہمدم نہ کبھی بن دلِ درویش مرے!
وہ جو ہوتا ہے تعلق میں کبھی کا کم کم

نثار ترابی

غزل [نذرِ غالب]

گزرے گی کیسے شوق کو ارزاں کیے ہوئے
اس طور خود کو بے سر و ساماں کیے ہوئے

بے زور ہیں، پہ رہتے ہیں، ہر آن خود سے ہم
صد حیلہ ہائے دست و گریباں کیے ہوئے

کیا اصلِ مدعا ہے کوئی جانتا نہیں
یہ ہم جو لغزشوں کو ہیں عریاں کیے ہوئے

فرصت جو دے یہ دنیا، تو آئیں اِدھر کو بھی
مدت ہوئی ہے، آپ سے پیماں کیے ہوئے

نشتر سے کم نہیں ہے، جو نکلے ہے منہ سے بات
رکھتے ہو، حرف حرف ہی، پیکاں کیے ہوئے

اُس کو خدا سمجھتے ہیں، جس کو سمجھتے ہیں
ہم جان و دل ہیں، تابعِ یزداں کیے ہوئے

اس حوصلے کی داد، کوئی دے نہ دے ہمیں
رکھتے ہیں دل کو، صاحبِ ارماں کیے ہوئے

طارق بٹ

غزل

راحت سرحدی

کہیں بھی بامِ فلک پر کوئی ستارہ نہیں
مجھے تو لگتا ہے یہ آسماں ہمارا نہیں

مرے خیال میں وہ وقت رائگاں گزرا
تمھارے حسن کے سائے میں جو گزارا نہیں

اگرچہ ہوتی ہے ہر شے کی انتہا کوئی
سرابِ عشق کا لیکن کہیں کنارہ نہیں

جو وقت پڑنے پہ ڈھے جائے آپ سے پہلے
وہ ایک بوجھ تو ہو سکتا ہے سہارا نہیں

کسی کے تل کا بدل جا کے کہنا حافظ سے
ہے کائنات ثمر قند اور بخارا نہیں

یہ آئنہ ابھی پوری طرح نہیں ٹوٹا
تجھے بھلا کے بھی دل سے مگر اتارا نہیں

بنی تھی جان پہ راحت مگر خدا کے سوا
کسی کو اپنی مدد کے لیے پکارا نہیں

غزل

گھڑی نے اب بھی سر کو چھپایا ہوا ہے کیا؟
پھر آسماں زمیں سے ملایا ہوا ہے کیا؟

آواز بھی لگاؤ کہ بازار بیٹھے ہو
کچھ تو کھلے کہ ڈھیر لگایا ہوا ہے کیا؟

تم لوح پوری پڑھ کے سناؤ تو بات ہو
لکھا ہوا ہے کیا یہ مٹایا ہوا ہے کیا؟

تجھ پر تو پہلے ہی مری آنکھوں کے نقش ہیں
تُو پہلے بھی کہیں نظر آیا ہوا ہے کیا؟

کوہِ ندا کی باتوں میں آجاتے ہیں، جب آئیں
یہ شور تیرا میرا مچایا ہوا ہے کیا؟

یہ کیا کہ آگے دیکھنا ، پھر پیچھے دیکھنا
دونوں طرف کو تیر چلایا ہوا کیا؟

آجا کہ میں اندھیرا ہی کرتا ہوں کچھ سبیل
تو اپنی روشنی کا ستایا ہوا ہے کیا؟

میری طرح کے لوگ بہت جمع ہیں یہاں
تیری طرح کا پھر کوئی آیا ہوا ہے کیا

تم خود کو وہ سمجھتے ہو جو میں سمجھتا ہوں
تم نے مرا خیال چرایا ہوا ہے کیا

یہ طائرِ خیال کبھی ہے ، کبھی نہیں
یہ بھی اک آدمی کا ستایا ہوا ہے کیا

وہ دھوپ کیا ہوئی مری، بس چھوڑو، کیا ہوئی
تم سایہ کرنے آئے تھے، سایہ ہوا ہے کیا

شاہین عباس

غزل

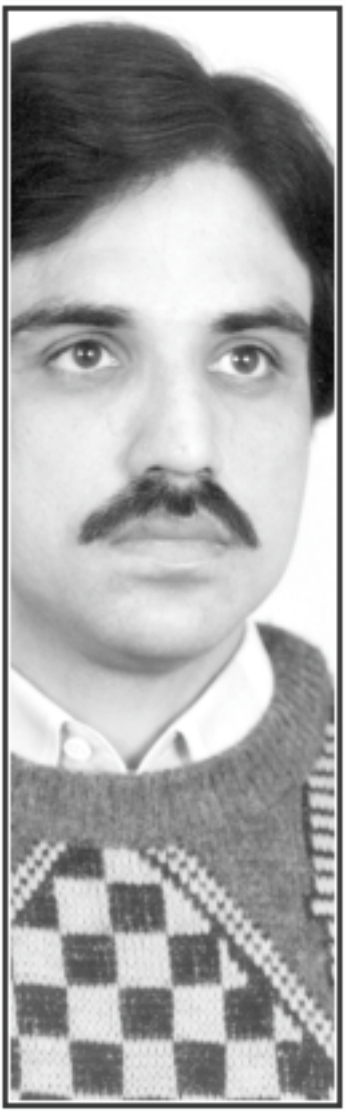

جمشید چشتی

بات لگتی ہے پرانی برسوں
ہوئے ، برسے ہوئے پانی ، برسوں

یہ وہی بیج اُگا ہے ، جس نے
بات مٹّی کی نہ مانی برسوں

چُپ تو چُپ ہے ، وہ مری باتوں کے
نہ سمجھ پایا معانی برسوں

میں نے دیکھی ہے اِسی ساحل پر
خشک دریا کی روانی برسوں

ایک موسم ہے ، گزر جائے گا
یاد آئے گی جوانی برسوں

سر کٹاتا ہے کوئی دم بھر میں
اور چلتی ہے کہانی برسوں

کوئی انعام ہَوا کو ، جس نے
کی ہے پیغام رسانی برسوں!

وہ تو جمشید بس اک ذرّہ تھا
خاک جس دشت کی چھانی برسوں

غزلیں

اپنے وعدوں سے گر مکر جاتے
منہ دکھانے کو پھر کدھر جاتے
جس طرح ہم نے زندگی کی ہے
آپ ہوتے تو آپ مر جاتے
اک دلاسہ شجر کو کافی ہے
گُل نہ جاتے اگر ، ثمر جاتے
آپ کرتے جو آئنہ داری
آئنے اور ہی سنور جاتے
پھول بننے میں ایک خدشہ تھا
شاخ ہلتی تو ہم بکھر جاتے

افتخار شاہد

جب میں لوٹا تمھارے گاؤں سے
دھوپ لپٹی ہوئی تھی چھاؤں سے
اک محبت تھی اک زمانہ تھا
کیسے لڑتا میں دو خداؤں سے
یار تم تو چراغ والے ہو
تم بھی لڑنے لگے ہواؤں سے
پھول ہیں ، اس لیے ہماری بھی
آشنائی ہے ان خزاؤں سے
میری گھڑی میں اک دعا رکھ دو
سامنا ہے مرا بلاؤں سے

قتل گاہوں سے گر صدا آتی
ہم سے پہلے ہمارے سر جاتے
سارہانوں سے دوستی کر لی
یہ نہ کرتے تو ہمسفر جاتے
یہ بچاؤ کی ایک صورت تھی
لوگ ڈرتے نہیں تو مر جاتے
ہم تو مجبور تھے مگر شاہد
یار لوگوں کے گھر تھے ، گھر جاتے

تیرا آنچل اگر بکھر جائے
عطر برسے گا ان فضاؤں سے
اس لئے بھی زمیں کو چھوڑا ہے
آ رہی تھی صدا خلاؤں سے
پہلے بارہ برس محبت میں
دوستانہ رہا صداؤں سے

غزل

مسعود احمد

پھولوں کو خوشبو آتی ہے
گلشن میں جب تو آتی ہے

چاندنی چاندنی رات سے پہلے
پیر تمہارے چھو آتی ہے

جام صراحی جیسی لڑکی
کرکے روز وضو آتی ہے

برزخ کے اسرار میں گم صم
نیند کسی پہلو آتی ہے

سچ مچ میری ذات کے اندر
مجھ سے پہلے تو آتی ہے

لاتقنطوا اس کی رحمت
خلقت تقنطوا آتی ہے

چاروں جانب گھوم رہا ہوں
جیسے تو ہر سو آتی ہے

اس کی یاد بھی جیسے خود وہ
خوش طینت خوش خو آتی ہے

غزل

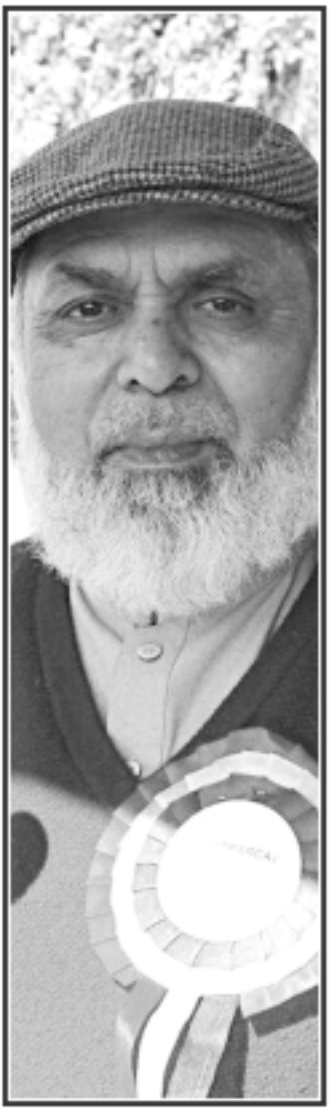

جِس سے ہر شخص ہے بیزار، بدل ڈالیں گے
ہم سیاست کا یہ معیار بدل ڈالیں گے

جس نے لُوٹا ہے مرے دیس کی مٹّی کا سہاگ
اِس کہانی سے وہ کردار بدل ڈالیں گے

تو نے سینچا ہے جسے اپنے لہو سے برسوں
یہ تو پل بھر میں وہ گلزار بدل ڈالیں گے

میں نہ کہتا تھا کہ یہ لوگ تو سوداگر ہیں
ترے اجداد کی اقدار بدل ڈالیں گے

سُن اے نیلام گھروں تک ہمیں لانے والے!
ہم ترا مصر کا بازار بدل ڈالیں گے

ہم نے سامانِ سفر باندھ لیا ، باندھ لیا
اب ترے ظلم کے آثار بدل ڈالیں گے

یاد رکھنا کہ وہ دن دور نہیں جب یہ نظام
بخدا ہم سے گنہگار بدل ڈالیں گے

جس میں محصور ہے اِس دور کا انسان انیس
اُس قفس کے در و دیوار بدل ڈالیں گے

محمد انیس انصاری

غزل

گفتگو لاجواب بیچیں گے
پانی کہہ کر سراب بیچیں گے

یاد رکھنا سدا کے یہ بھوکے
اپنا گھوڑا رکاب بیچیں گے

دیکھ لینا یہ ڈالروں کے عوض
بارشوں کا عذاب بیچیں گے

یہ جو عالی جناب کہتے ہیں
کل یہ عالی جناب بیچیں گے

غم کی قیمت تو ہونے دو معلوم
لوگ خوشیاں شتاب بیچیں گے

حرف و دانش کے ہم امیں ثاقب
خوب دیکھیں گے خواب بیچیں گے

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ شام چاند تھا خالد تو صبح سورج تھا
مرے فلک سے نہ اُترا فراق کا تارا

غزلیں

"سچ ہے کہ کسی کے بھی کوئی کام نہ آئے"
کیا کیا مرے ایثار پہ الزام نہ آئے

نادان غلط راہ سے ہٹتا نہیں کوئی
جب تک کہ نظر صورتِ انجام نہ آئے

میں جن کی خوشی کے لئے غم سہتا رہا ہوں
جب وقت پڑا وہ بھی مرے کام نہ آئے

جاتا نہ رہے لُطف کہیں تشنہ لبی کا
ساقی مرے ہاتھوں میں کوئی جام نہ آئے

جب ختم ہوا سلسلۂ رسمِ ملاقات
بہتر ہے کہ ہونٹوں پہ بھی اب نام نہ آئے

اُس بزم میں اقبال مناسب نہیں جانا
اُس سمت سے جب تک کوئی پیغام نہ آئے

اقبال سروبہ

راستے سے دیا ہٹا تُو نے
مجھ پہ یہ ظلم کیوں کیا تُو نے

میں نہیں کہتا تُو نہیں میرا
لوگ کہتے ہیں کچھ سُنا تُو نے

ایک ہی غمگسار تھا تیرا
کر دیا ہے اُسے خفا تُو نے

دوسرے کا ہوں منتظر کب سے
ایک بدلہ تو لے لیا تُو نے

یار چھوڑا نہیں کہیں کا مجھے
مجھ کو دی ہے بڑی سزا تُو نے

مجھ کو اقبال در بدر کر کے
مار ڈالا ہے بے وفا تُو نے

غزل

کہاں ہوں کون ہوں کیسا ہوں اور کیا ہوں میں
مجھے نہ کوئی بتائے ، یہ جانتا ہوں میں

عدو کے ساتھ عداوت نہ چل سکے گی مری
مرے عزیز محبت کا دیوتا ہوں میں

بُلا کے پاس فرشتے مجھے بٹھاتے ہیں
یہ اور بات کہ تھوڑا بہت بُرا ہوں میں

کچھ اس لئے بھی ڈراتے ہیں یہ ڈکیت مجھے
کہ ہر لُٹی ہوئی بستی کا ہمنوا ہوں میں

سلام کر کے تمھاری دراز پلکوں کو
تمہاری جھیل سی آنکھوں میں کھو گیا ہوں میں

بُروں کے ساتھ بھی اپنے تعلقات رہے
سو میں یہ کہہ نہیں سکتا کہ پارسا ہوں میں

بنانے والے نے کیسا بنا دیا تجھ کو
ترے وجود کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں

میں اپنی اصل میں صحرا نشین ہوں لیکن
کسی کے واسطے دریا بنا ہوا ہوں میں

وہ اور شخص ہے جس نے مجھے تلاش کیا
تجھے تو راہ میں بیٹھا ہوا ملا ہوں میں

مرے قریب زمانے کے غم نہیں آتے
کہ غم گسارِ شہیدانِ کربلا ہوں میں

تمھاری بات پہ مجھ کو یقین ہے انصر
تمھی بتاؤ کہ اچھا نہیں ہوں یا ہوں میں

انصر حسن

غزل

اے مری جانِ سخن شمعِ شبستانِ غزل
یہ سراپا ہے ترا یا ہے گلستانِ غزل

اس لیے میں کر رہا ہوں ناز برداری تری
تجھ کو تعریفِ غزل میں لکھا ہے جانِ غزل

رب کی اس نعمت کی یارو قدردانی کے طفیل
ہوں گے ہم سب اُس جہاں میں بھی اسیرانِ غزل

اس کی لذت کس قدر ہے آخرش جادو اثر
ایک شب میں ہوگئے ہم جاں نثارانِ غزل

ہو رہے ہو خود بھی اس کے کیف سے محظوظ روز
یہ بھی سوچا ہے کبھی تم نے حریفانِ غزل

ہم سے بس امید رکھو پیار کے نغمات کی
ہم ہیں عشاقِ غزل ہم ہیں فدایانِ غزل

شعریت، رومانیت سے ہے بھرا اک ایک انگ
خوبصورت جسم ہے اس کا کہ دیوانِ غزل

تم اگر بچھڑیں تو مر جائے گی میری شاعری
اے مری جاناں تمہی تو ہو مری جانِ غزل

ذکی طارق

غزل

جھانکوں گا کسی روز میں دیوار کے پیچھے
کیا کیا ہیں عوامل ترے انکار کے پیچھے

اس ہی کے سبب کھلتے ہیں تلوار کے جوہر
جو ہاتھ ہوا کرتا ہے تلوار کے پیچھے

کردار میں یہ پختگی یونہی نہیں آئی
اسلاف کا کردار ہے کردار کے پیچھے

یاروں کی طرف سے جو نیا وار ہوا ہے
ہے ہاتھ کسی اور کا اس وار کے پیچھے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا ، تجھ پہ کُھلا ، یا ، نہ کُھلا میں

غزل

بھنور سے کہہ دو کہ دریا مرا محافظ ہے
میں ریگ زاد ہوں، صحرا مرا محافظ ہے

اسے عدو کے عزائم میں کیا بتاؤں بھلا
اسے خبر ہے وہ کتنا مرا محافظ ہے

گزند کیسے اٹھاوں میں اس کے ہاتھوں سے
یہ عشق سارے کا سارا مرا محافظ ہے

جو دوسروں سے میں عزت سے پیش آتا ہوں
یہ رنگ ڈھنگ، یہ جذبہ مرا محافظ ہے

ہوں جس سے حالتِ جنگ وجدال میں فیصل
حقیقتاً وہی خفیہ مرا محافظ ہے

عزیز فیصل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جی سے چاہا تھا اگر مر نہ سکوں، زندہ رہوں
ڈوب مرنے نہ دیا، پار اُترنے نہ دیا

غزلیں

جھوٹ ہے ہر ایک منظر، ہر نظارہ جھوٹ ہے
اب کُھلا مجھ پر کہ یہ سارے کا سارا جھوٹ ہے

لگ رہا ہے آسماں بھی آنکھ کا دھوکا مجھے
یہ جو بے بنیاد سچ ہے، بے سہارا جھوٹ ہے

آؤ سچ ثابت کریں ہم، اپنے اپنے جھوٹ کو
اک ہمارا جھوٹ ہے اور اک تمھارا جھوٹ ہے

ہم نے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے، اندازہ نہیں
جھوٹ ہے ہر اک منافع، ہر خسارہ جھوٹ ہے

سچ کا سودا ہو رہا تھا دفترِ انصاف میں
جھوٹ کے منہ پر کسی نے دے کے مارا جھوٹ ہے

میں بھی جھوٹا شخص ہوں یہ مان لیتا ہوں مگر
ایک جھوٹے شخص کو بھی کب گوارا جھوٹ ہے

رانا سعید دوشی

ہوں ادھورے تو پریشان بہت کرتے ہیں
خواب بھی آنکھ کا نقصان بہت کرتے ہیں

کُرتھیں آتے ہیں لوگوں کی نظر بندی کا
دیکھنے والوں کو حیران بہت کرتے ہیں

کچھ تواضع کا سلیقہ بھی ہے کم کم مجھ میں
کچھ تکلف بھی یہ مہمان بہت کرتے ہیں

ایک شیطان ہے بہکائے بھلا کس کس کو
کام شیطان کے انسان بہت کرتے ہیں

جرم جو خواب میں ہو جاتے ہیں ہم سے سرزد
آنکھ کھلنے پہ پشیمان بہت کرتے ہیں

قیس کہتا تھا کہ صحراؤں میں ہوتا ہے سکون
تنگ یہ دشت کے طوفان بہت کرتے ہیں

غزلیں

ثابت کرے یہ وقت کہ جذبات کچھ نہ تھے
گزرے حسین جتنے بھی لمحات کچھ نہ تھے

خنجر تھا میرے ہاتھ میں آلات کچھ نہ تھے
مجھ بے ضرر سے آپ کو خطرات کچھ نہ تھے

مانگا ہی کیا تھا ہم نے فقط ربط کے سوا
اے شخص ! ہم کو تجھ سے مفادات کچھ نہ تھے

اک اور بات لب پہ سجا کر وہ آ گئے
یعنی وہ پہلے والے بیانات کچھ نہ تھے

کُھلتا نہیں کسی پہ بھی اَسرار موت کا
اس زندگی میں یوں بھی طلسمات کچھ نہ تھے

کب جیت کے ارادے سے آئے تھے آج ہم
نقصان اس لیے بھی تہہِ مات کچھ نہ تھے

مجھ کو تو ایک شخص کی خواہش تھی، اے خدا!
میری نظر کے سامنے، دن، رات کچھ نہ تھے

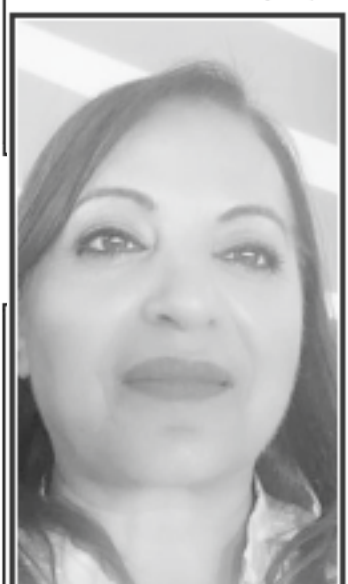

رخشندہ نوید

یہ حالت ہے بہت حیران سُن بھی
بدن تھا برف جیسا ، ہاتھ سُن بھی

محبت کا جو اُس مالک نے رکھا
اضافی میرے اندر ایک گُن بھی

تجھے گیتوں سے اک گہرا شغف ہے
کبھی دھڑکن ہمارے دل کی سُن بھی

تماشا تھا ، عجب تھا ایک منظر
عجب تھی اک الگ سی، دل کی دُھن بھی

ہر اک دم مسکراتے جانے والو
کبھی لگ جاتا ہے اندر سے گُھن بھی

میں قیدِ ہَست پر کر لوں قناعت
کسی ریشم کو میرے گِرد بُن بھی

غزل

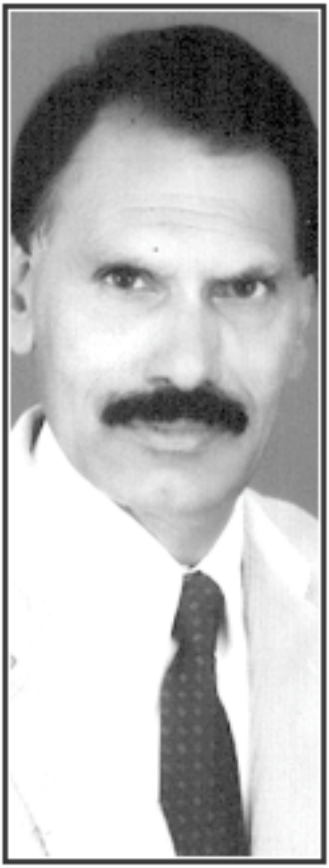

چاند ، سورج ، ستارے دیکھتے ہیں
آ کے تم کو وہ سارے دیکھتے ہیں

دیکھتے ہیں وہ تم کو بت بن کر
جو بھی جلوے تمھارے دیکھتے ہیں

تم بھی پڑھ لو نوشتۂ دیوار
ہم تو کب سے اشارے دیکھتے ہیں

ہر طرف لاشے ، سوختہ خیمے
جا بجا غم کے مارے دیکھتے ہیں

ہر طرف حسن ہے جلیل اُس کا
ہر سو اس کے نظارے دیکھتے ہیں

اب بھی قدموں پہ ہم کھڑے ہیں جلیل
ہم کو دشمن ہمارے دیکھتے ہیں

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوچو تو کچھ نہ سمجھو ، سمجھو تو کچھ نہ بولو
پھر چپ کا حُسن دیکھو ، بیکار لب نہ کھولو

غزل

بتا رہی ہے یہ تپتی ہوئی زمین مجھے
کہاں کہاں سے ملے ہیں منافقین مجھے

تمام عمر جو اوجھل رہے ہیں نظروں سے
دکھائی دینے لگے ہیں وہی مکین مجھے

تمھارے شہر کے گل رنگ راستوں کی طرف
کبھی گماں تو کبھی لے گیا یقین مجھے

فلک کو آنکھ کی پُتلی میں رکھ کے بیٹھا ہوں
سمیٹ لے نہ کسی روز یہ زمین مجھے

وطن کی مٹی سے مہکار کیوں نہیں آتی
سوال کرتے ہیں بچے کئی ذہین مجھے

الاؤ سے بھی گذر کر میں راکھ ہوتا نہیں
شکست دے نہیں سکتے مخالفین مجھے

میں خود کو محفل یاراں سے دور رکھتا ہوں
فریب دیتے ہیں اکثر یہی حسین مجھے

شکستگی ، یہ غلامی ، یہ نفرتوں کا جہاں
ملے ہوئے ہیں وراثت میں زخم تین مجھے

محمد نوید مرزا

غزل

کھینچئے نقشہ غزل میں درد کی تصویر کا
ٹوٹ جائے گا وگرنہ دل جناب میر کا

ہم نے وحشت میں نے نہ جانے کس جگہ رکھا قدم
اک نشاں تک بھی نہیں ہے حلقۂ زنجیر کا

مل گئی ہے زخمِ دل کو ایک پل آسودگی
تھم گیا ہے سلسلہ بھی درد کی تشہیر کا

کس نے شہرِ عشق کی بنیاد رکھی خواب پر
کس کا دل خواہاں رہا ہے دشت کی تعمیر کا

پاؤں اٹھتے ہی رہے ہیں جانبِ دشتِ جنوں
سلسلہ بنتا رہا ہے وحشت و زنجیر کا

ذہن کو بھی اس کی یکتائی کا ہے پختہ یقیں
دل بھی شیدا ہو گیا ہے حسنِ عالمگیر کا

جست بھرنی ہے زمیں سے آسمانوں تک مجھے
دیکھنا ہے مرحلہ اب خواب کی تعبیر کا

دل کی دیواروں پہ پہلے عشق کی تحریر پڑھ
پھر دکھاتا ہوں تجھے میں آئنہ تفسیر کا

جیتنا ہے تو اُسے بدلے میں جاں کے جیت لے
کچھ مزہ بھی آئے گا پھر حسن کی تسخیر کا

گردشِ ہستی کی آصف ایک ہی پرکار ہے
دائرہ پھیلا ہوا ہے محورِ تقدیر کا

آصف شفیع

غزل

خشک پتا بھی گرے صحن میں ڈر جاتا ہوں
شام ہوتے ہی میں سناٹوں سے بھر جاتا ہوں

ٹیک جو مجھ سے لگائے کھڑے ہیں گر نہ پڑیں
اس لیے پاؤں بدلتے ہوئے ڈر جاتا ہوں

شام کی بانجھ ہتھیلی پہ چراغوں کی لویں
تھرتھراتی ہیں تو میں خوف سے بھر جاتا ہوں

جب جلاتی ہے مجھے لوگوں کے لہجوں کی تپش
تری یادوں کے سمندر میں اتر جاتا ہوں

ویسے اس عمر میں کچھ یاد کہاں رہتا ہے
ویسے اک نام جو سن لوں تو ٹھہر جاتا ہوں

جس پہ آتے تھے نظر چاند ستاروں کے ہجوم
اب اسی راہ سے چپ چاپ گزر جاتا ہوں

شعر کہنا تو بہت آگے کی منزل ہے میاں
میں تو بس سوچتے بس سوچتے مر جاتا ہوں

روز عرفان میں چنتا ہوں بدن کے ریزے
روز تنہائی کے صحرا میں بکھر جاتا ہوں

عرفان صادق

غزل

وہ ہم سے خاک نشینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے
مکان اپنے مکینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

ہمارا سارا اثاثہ تھا پہلی منزل پر
شکستہ بام کے زینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

نئے وطن میں بھی پہلا خمار جا نہ سکا
ہم اپنی کھوئی زمینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

فرار ہو گئے محبوب مہ جبین و رقیب
غُلامِ شاہ بھی تینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

اُنھی کے دم سے ولایت کا راستہ کُھلتا
جو چند سجدے جبینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

تھی جس کے خون میں رنگت سفید پتھر کی
وہ کس بنا پہ نگینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

وہی کمان کی لرزش سے کانپ اُٹھے ہیں
کِسی کے تیر جو سینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

بَلا کی دُھوپ سے گُزرے تو شام دیکھی تھی
ہم اپنے خون پسینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

چھُپی ہوئی تھی ہر اک چیز گھر کے اندر ہی
وہ اور جا پہ خزینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

یہی سنا تھا مُبارک ہیں چاند کے کچھ دن
سو ہم بھی سعد مہینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

اُبھر چکا تھا نیا آفتاب دریا پر
مگر وہ ڈُوبے سفینوں کو ڈھونڈتے ہی رہے

آفتاب خان

غزل

جو مادرِ گیتی کا وفادار نہیں ہے
وہ شخص ہے فنکار ، قلمکار نہیں ہے

دعویٰ ہے اگر مجھ سے محبت کا تجھے بھی
مجھ کو بھی ترے پیار سے انکار نہیں ہے

یہ غم کی کہانی میں کسے جا کے سناؤں
دشمن ہیں بہت کوئی مرا یار نہیں ہے

عاشق تو بنا پھرتا ہے ہر شخص یہاں پر
جاں دینے کو لیکن کوئی تیار نہیں ہے

میں جانتا ہوں میرے خدا تیرے علاوہ
دنیا میں مرا کوئی بھی غمخوار نہیں ہے

بے خوف گزر جاؤں گا اس راہ گزر سے
صحرا ہے مرے سامنے دیوار نہیں ہے

اس بار چمن میں ہے عجب طرز کا موسم
رنگین ہر اک پھول ہے مہکار نہیں ہے

یہ حلقۂ دانش ہے یہاں کوئی بھی دانش
ناقد ہیں کوئی علم کا مینار نہیں ہے

اعجاز دانش

غزلیں

بارگاہِ دل پہ اُترا استعارہ اور ہے
آنکھ کے بازار نے دیکھا نظارہ اور ہے

لگ رہا ہے اس کے چہرے کے تذبذب سے یہی
وقت نے اس مرتبہ کرنا اشارہ اور ہے

روشنی کیوں دوسروں کی راس آنے لگ گئی
جب یہ طے تھا میری قسمت کا ستارہ اور ہے

دیکھ کر رشتہ رقابت کا ہوا یہ انکشاف
پیار کے دریا سے ملتا اک کنارہ اور ہے

کچھ محافظ رہ نمائی کے لیے مل جائیں گے
متن کی سرحد سے آگے فکر پارہ اور ہے

مختلف پرچہ تھا جس میں صرف تعبیریں چھپیں
خواب کے موضوع پر نکلا شمارہ اور ہے

افتخار الحق

آئینہ بن کے عکس میں ترمیم کیا کریں
اپنے لکھے کلام کی تفہیم کیا کریں

رشتوں کو دفن کرتے ہی آنے لگی صدا
دل کے اثاثہ جات کی تقسیم کیا کریں

الفاظ پوچھتے ہیں یہ نسیاں میں جھانک کر
اس شہرِ بے خیال کی تجسیم کیا کریں

تھک کر گرا ہے سرحدِ تعبیر کے ادھر
ایسے ضعیف خواب کی تعظیم کیا کریں

اپنا وجود ماضی سے کرتا نہیں جدا
اے حالِ کالعدم تری تقویم کیا کریں

جس کو کیے بغیر سزا پا چکے ہیں ہم
ایسے انوکھے جرم کو تسلیم کیا کریں

جب وصل کے صحیفے کی تفسیر پڑھ چکے
یکجائی کی اکائی کو دو نیم کیا کریں

غزل

عشق میں شرک نہیں نہ کوئی بدعت کیجے
عشق کا نام محبت ہے، محبت کیجے

آئیں، اک بار مجھے دیکھ کے دیکھیں خود کو
آئنہ بدلا نظر آئے تو حیرت کیجے

ہار جانے پہ یوں شرمندہ نہیں ہونا ہے
دوسرا دیتی ہوں موقع..... ذرا ہمت کیجے

خود بڑے ہونے کا احساس نہ ہونے دیں انہیں
گھر میں چپ چاپ پڑے رشتوں کی عزت کیجے

زندگی اپنی محبت کے لیے ہی کم ہے
آپ کو کس نے سکھایا ہے کہ نفرت کیجے

فیصلہ دیجے جو حق والوں کے حق میں جائے
مصلحت والی مگر کوئی نہ صورت کیجے

بوجھ خود اپنا اٹھانا ہے ثمینہ سید
خود کا ذمہ ہے تو خود اپنی ہی خدمت کیجے

ثمینہ سیّد

غزل

یوں تو ہنستے ہنساتے رہتے ہیں
زخم دل کے چھپاتے رہتے ہیں

یہ ہے دنیا سدا رہے گی یونہی
لوگ یاں آتے جاتے رہتے ہیں

دوست ہوتے تھے جو کبھی اپنے
آج کل منہ چھپاتے رہتے ہیں

وقت ہوتا ہے ہم نہیں ہوتے
وقت ایسے بھی آتے رہتے ہیں

ریت اندر کی سمت گرتی ہے
ہم جو طوفاں اٹھاتے رہتے ہیں

تو سنے یا نہیں سنے مرے دوست
ہم ترے گیت گاتے رہتے ہیں

اس قدر آگ ہے یہاں اصغر
اپنا دامن بچاتے رہتے ہیں

اصغر علی بلوچ

غزل

بار الفت دل مضطر سے اٹھایا نہ گیا
''اک دیا تم سے محبت کا جلایا نہ گیا''

دیکھتے دیکھتے ہوتے گئے یوں رستے جدا
تم سے روکا نہ گیا مجھ سے بلایا نہ گیا

ہم سے گر تم ہو گریزاں تو گریزاں ہی رہو
فاصلہ ہم نے بڑھایا بھی ، بڑھایا نہ گیا

آج بھی رات میں سناٹے ڈراتے ہیں مجھے
آج بھی دل سے اس آسیب کا سایا نہ گیا

تم نے سوچا ہے کبھی کیسے گزرتی ہے مری
تم نے پوچھا نہیں اور ہم سے بتایا نہ گیا

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر رنج تری عطا تھا خالد
ہر دکھ اک در بے بہا تھا

غزل

فاصلہ اک دوسرے سے اور زیادہ کر دیا
آج سوشل میڈیا نے سب کو تنہا کر دیا

خودکشی کرنے کو یارو کیوں نہ ہوں مجبور لوگ
حاکموں نے آب و دانہ اتنا مہنگا کر دیا

ہجر کی تاریکیوں میں ہو رہا تھا غرق میں
وصل کی پُروا نے چاروں سمت اُجالا کر دیا

اُس جہاں میں رحمتوں کی بارشیں ہوں گی نصیب
اِس جہاں میں جس نے بھی تھوڑا سا اچھا کر دیا

حکمِ ربی تھا سو پیارے لاڈلے شبیرؓ نے
اُف نہ کی اور سب کا سب قربان کنبہ کر دیا

یہ خبر سُننے کو ہیں بے تاب بستی کے مکیں
کر دی سستی گیس بل بجلی کا آدھا کر دیا

اُس کے احسانوں تلے کب تک دبہ شاہد رہے
قوم کا مقروض جس نے بچہ بچہ کر دیا

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

مثالِ ابر کڑی دھوپ میں بھی سایہ کرے
اب اُس کی باتیں کوئی تو مجھے سنایا کرے

یہ بامِ ہجر ہے، آسیب اِس میں رہتا ہے
سو، وقتِ شام کوئی اس طرف نہ جایا کرے

مَیں اپنے آپ میں تقسیم ہونے لگتا ہوں
اُسے کہو کہ مرے سامنے نہ آیا کرے

کبھی تو روشنی آئے مرے دریچے میں
کبھی وہ خواب حقیقت میں بھی دکھایا کرے

فلک پہ صبح کو سورج ظہور ہونے تک
مرا وجود کوئی شب سے مانگ لایا کرے

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کتنے درد چمک اٹھے ہیں
دل نے سورج کو شرمایا

غزل

ہر محبت کہاں پانے کے لیے ہوتی ہے
یہ تو بس دل میں بسانے کے لیے ہوتی ہے

ہر گھڑی غم کو چھپانے کے لیے ہوتی ہے
بارِ الفت کو اٹھانے کے لیے ہوتی ہے

آپ سمجھے کہ بچانے کے لیے ہوتی ہے
زندگی جان لٹانے کے لیے ہوتی ہے

رب سے ہے عالمِ ارواح میں پیمانِ اَلست
زندگی وعدہ نبھانے کے لیے ہوتی ہے

اپنی تم سوچ کی کھڑکی کو کھلا رہنے دو
یہ تو افکار کے آنے کے لیے ہوتی ہے

اک کرن کافی ہے اندھیاروں میں بھٹکوں کے لیے
راستہ ہم کو دکھانے کے لیے ہوتی ہے

نقرئی ریزے کی مانند ہے ہر یاد افروز
اپنے ماتھے پہ سجانے کے لیے ہوتی ہے

افروز رضوی

غزل

بہرِ درماں جو کوئی درد کا پیکر نکلے
شاخِ احساس پہ تنویر سجا کر نکلے

اور پھر بارشِ انوار سے بھر دے دامن
تھامے بادل کی کلائی کوئی رہبر نکلے

وہ جو گردابِ بلا جھیل گئے جھیل گئے
بحرِ ہستی کے تلاطم میں شناور نکلے

جن کے سینے میں دھڑکتا نہیں ریزہ کوئی
دوست ایسے ہی مری راہ کے پتھر نکلے

وہ کہ جو قوتِ بازو پہ بہت نازاں ہے
آج آ جائے مقابل مرے، باہر نکلے

بدگمانی نے کئی چہرے بجھا رکھے تھے
آزمائے تو رضا سرو و صنوبر نکلے

رضا اللہ حیدر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کس کو چھو کر ماہتابی ہو گیا
جھیل کا پانی شہابی ہو گیا

غزل

جب مچل اٹھتے ہیں جذبات تو میں لکھتا ہوں
تپنے لگتے ہیں خیالات تو میں لکھتا ہوں

حبس و گرمی سے سلگتے ہوں شب و روز کہ پھر
ٹوٹ کر برسے جو برسات تو میں لکھتا ہوں

دور ماضی کے کسی بند دریچے سے کبھی
جھانکنے لگتے ہیں لمحات تو میں لکھتا ہوں

ضبط کی حد میں اگر ہوں تو انہیں سوچتا ہوں
حد سے بڑھ جاتے ہیں صدمات تو میں لکھتا ہوں

بات جو کہہ نہیں پاتا ہوں کسی سے برسوں
دل میں چبھتی ہے وہی بات تو میں لکھتا ہوں

بات کہنی ہو مگر کوئی نہ سننا چاہے
اس طرح کے ہوں جو حالات تو میں لکھتا ہوں

راجہ عبدالقیوم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زخم لگا تھا مگر لہو نہ بہا تھا
بحرِ خموشی تھا میں ، وہ سنگِ صدا تھا

غزل

امیدِ منفعت ہے محبت ، وفا غرض
ملتا نہیں کسی سے بھی کوئی ، بِنا غرض

درخواست ہو کہ عرضی ہو، ہر مدعا غرض
حتیٰ کہ بارگاہِ خدا میں دعا ، غرض

ہے ابتدا بھی اس کی غرض ، انتہا غرض
دنیا کا ہر معاملہ ، ہر سلسلہ غرض

شکوہ ہو کج روی کا کہ خوئے وفا غرض
مانا کہ ہے غرض یہ مگر ہے بجا غرض

اپنے تو سارے کام ادھورے ہی رہ گئے
دنیا کے کاروبار سے ہم کو ہے کیا غرض

پوچھا کہ کون چیز اِدھر کھینچ لائی ہے
وقفہ ذرا کیا نہیں ، فوراً کہا غرض

احساس بھی ہے گرچہ، محبت بھی ہے مگر
اک چیز اور بھی ہے جو سب سے سوا، غرض

ہر چیز گھومتی ہے ضرورت کے چاک پر
خوفِ سزا ہو پیش کہ شوقِ جزا ، غرض

شاید تری تمنا بھی ہو منتظر تری
یونہی نہ مان ہار تُو ، لے کے تو جا غرض

خالدہ انور

غزل

اتنا خراب ہو کے بھی اچھا نہیں لگا
جیسا وہ چاہتا تھا میں ویسا نہیں لگا

جو دل کی بات تھی مرے دل میں ہی رہ گئی
میں چپ رہا کہ اس کا ارادہ نہیں لگا

جو خواب میں ہوا تھا چلو خواب ہی سہی
سن کر بتاؤ کیا تمھیں اچھا نہیں لگا؟

گر ہو سکے تو خود سے کبھی پوچھنا ضرور
کیسا تمھیں لگا ہوں میں کیسا نہیں لگا

مدت کے بعد آج ملا تو خوشی ہوئی
اور غم ہوا کہ آج وہ اپنا نہیں لگا

کیا کیجئے جناب نے سمجھا ہے عام شخص
ورنہ میں دنیا والوں کو کیا کیا نہیں لگا

بس ایک ہی کسک ہے جو دل سے نہیں گئی
باندھا تھا جس جگہ پہ نشانہ نہیں لگا

تم اتنے دور ہو کے بھی کتنے قریب ہو
میں لمحہ بھر بھی خود کو اکیلا نہیں لگا

جس کو بھی جو لگا ہوں مجھے اس سے کیا غرض
کیا کم ہے یہ صغیر کسی سا نہیں لگا

صغیر احمد صغیر

غزل

پیاسی نظر کو یار کی جب دید ہو گئی
سچ پوچھیے تو اپنی وہیں عید ہو گئی

جب عید ہو گئی تو سمجھ لو کہ اس طرح
عہدِ وفا کی خیر سے تجدید ہو گئی

دل اور آنکھ کا ہی یہ سارا ہے تال میل
تجسیم ہو گئی کبھی تجرید ہو گئی

پہلی نظر نے ہی مجھے کُندن بنا دیا
تمہید ہی خلاصۂ توحید ہو گئی

آنے لگی ہے پیش رُکاوٹ قدم قدم
اُن کی طرف سے بھی مری تائید ہو گئی

کچھ دیکھنے کا عزم کیا، پردے پڑ گئے
کچھ سوچنے کی دیر تھی، تردید ہو گئی

معروض کا جواب ہے انشائے فکر و فن
تجنیس کے سوال پہ تقعید ہو گئی

زنجیرِ عدل آج ہلا کر بھی کیا ملا
پھر صبر کی غریب کو تاکید ہو گئی

نو میدیوں کا تازہ کرشمہ عجیب ہے
ہر سانس پیش خیمۂ اُمید ہو گئی

فیضان، اک رکھیل تھی دنیا تو سر بسر
اب زندگی بھی دیکھ لو بے دید ہو گئی

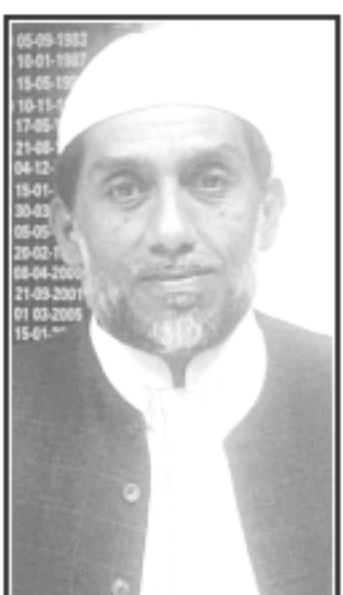

فیض رسول فیضان

غزل

جو ستارے کبھی آنکھوں سے اٹھائے گئے تھے
لہو روتے ہوئے مٹی میں بجھائے گئے تھے

آنکھ میں ٹوٹے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں سے ہیں
ہائے وہ لوگ جو خوابوں میں بسائے گئے تھے

اپنی تکمیل کو پہنچے ہی نہیں ہیں اب تک
جانے ہم کونسی مٹی سے بنائے گئے تھے

اس قدر خوف تھا باتوں کا ہماری کہ نہ پوچھ
ہم زباں کاٹ کے دربار میں لائے گئے تھے

اس زمیں پر جو ہمیں بھیجا گیا تھا تو ہم
آسمانوں کی زمینوں سے اٹھائے گئے تھے

رستہ ہموار انھوں نے ہی کیا سورج کا
کئی جگنو جو اندھیرے میں جلائے گئے تھے

صرف بندوق یا تلوار ہی ہتھیار نہ تھے
سینکڑوں لفظ تھے جو تیر بنائے گئے تھے

محمد اشرف کمال

غزل

میرے گھر سے خوشیوں کے تہوار ہجرت کر گئے
جب سے خوشیاں دینے والے یار ہجرت کر گئے

صحن کی دیوار کا دکھ یوں پرندوں نے لیا
چھوڑ کر گھر میں لگے اشجار، ہجرت کر گئے

ایک ہجرت لازمی ہے دن بدلنے کے لیے
اس لیے ہم زندگی کے پار ہجرت کر گئے

یہ ہماری عاجزی ہے: زندگی ہو، موت ہو
ہم خدا کے حکم پر ہر بار ہجرت کر گئے

دیکھنے والوں نے دیکھا زندگی کے کھیل سے
کیسے کیسے خوشنما فنکار ہجرت کر گئے

اب تو بس الفاظ لائے جا رہے ہیں بحر میں
شاعری سے اس لیے افکار ہجرت کر گئے

پوچھنے ہیں ہجرتوں کے دکھ اگر تو ہم سے پوچھ
ایک جیون کے لیے دو بار ہجرت کر گئے

رحمتِ سرکار سے محروم مکہ ہو گیا
جب مدینے کی طرف سرکار ہجرت کر گئے

مجھ کو اپنے ضبط پر اکمل بڑا ہی مان تھا
اشک، غم کی دیکھ کر یلغار ہجرت کر گئے

اکمل حنیف

غزلیں

کس کا خیال پھر دلِ مضطر میں آ گیا
اشکوں کا سیل، آنکھ کے ساگر میں آ گیا

کیا کیا بھلا بہار کے منظر میں آ گیا
سارا جمالِ یار، گلِ تر میں آ گیا

رسوائیاں اُسی کا مقدر ٹھہر گئیں
سودا غرورِ جاہ کا جس سر میں آ گیا

کل پھر کسی کی یاد کا جھونکا، بہ وقتِ شام
''دستک دیے بغیر مرے گھر میں آ گیا''

اُس وقت ہو گیا تھا مجھے مات کا یقیں
بھائی مقابلے پہ جو لشکر میں آ گیا

یوں چلتے چلتے، آپ سے ملنے کے واسطے
میں قیدِ غم سے عرصۂ محشر میں آ گیا

کرنا ہے ہم کو شام سے پہلے سفر تمام
یہ بات کہہ کے جوشِ سا رہبر میں آ گیا

شوکت عذاب جاں تھے مگر نہ یہ رات دن
لیکن کوئی خیال کہ پل بھر میں آ گیا

شوکت محمود شوکت

بے طرح جب یاد آئے شام کو اِک ہیر کی
چھیڑ دیتا ہے دلِ وحشی غزل، پھر میر کی

خونِ ناحق بہہ رہا ہے آج بھی چاروں طرف
آج بھی قسمت وہی ہے وادیٔ کشمیر کی

بات جو بگڑی ہوئی ہو، بات وہ بن کر رہے
جب ذرا تحریر بدلے، کتبۂ تقدیر کی

ایک گھر کا کس نے دو حصوں میں بٹوارا کیا؟
درمیاں، کس نے یہ دیوارِ انا تعمیر کی؟

کون بنتا ہے سہارا، بے سہاروں کا یہاں
کون سنتا ہے زمانے میں کسی دل گیر کی

ہجر کی راتوں میں تیری یاد کے جگنو مجھے
ظلمتِ شب میں کرن، جیسے کوئی تنویر کی

پا چکا ہوں زندگی کے درد سے شوکت نجات
اب ضرورت ہی نہیں باقی کسی اکسیر کی

غزلیں

ایک لمحہ ہے ترے حُسنِ نظر کا جاگنا
عشق ہے لیکن مسلسل عمر بھر کا جاگنا

زندگی کے چاک پر گردش کو رکھتا ہے رواں
کُوزہ گر کے ہاتھ میں شوقِ ہنر کا جاگنا

بنتا جاتا ہے تلاشِ آب و دانہ کا سبب
صبح سے پہلے ہر اِک شاخِ شجر کا جاگنا

کر گیا مجھ کو نئی سمتوں کی حیرانی میں گم
منزلِ گم گشتہ سے عزمِ سفر کا جاگنا

پھر کوئی پُرنم اُداسی دے گیا مجھ کو نبیل
صفحۂ دل پر کسی رنگِ اثر کا جاگنا

نبیل احمد نبیل

زندگی یوں بسر ہوئی تیرے خیال کے بغیر
دامنِ گُل ہو جس طرح کسبِ کمال کے بغیر

ایک عجیب شخص تھا کتنا عجیب شخص تھا
جب بھی ملا، ملا مجھے پُرسشِ حال کے بغیر

جُنبشِ لب اگر نہ ہو اور نہ زباں بھی ساتھ دے
ایسے جواب مانگتا تجھ سے سوال کے بغیر

آج نہیں تو کل سہی، کل کا بھی کب یقین ہے
نکلا ہے کوئی دن بھلا اپنے زوال کے بغیر

آئینۂ نگاہ سے مجھ پہ عیاں ہوا نبیل
ہجر تمام بے بسی عکسِ وصال کے بغیر

غزلیں

عمر گزری ہے اسی طور ہماری ساری
زندگی خاک نشینی میں گزاری ساری

بغض و نفرت کا کوئی سانپ نہ پالا دل میں
دیکھ چاہت سے بھری یار پٹاری ساری

میں تجھے اس کی وکالت سے کہاں روکتا ہوں
تو نے دیکھی ہی نہیں کارگزاری ساری

میں نے ہی دام میں آ کر ہے عیاں تم کو کیا
ورنہ سازش تو سمجھ لی تھی تمہاری ساری

دینے والے کی رضا ہے کہ وہ کب دیتا ہے
اپنی سانسیں بھی تو ہیں یار اُدھاری ساری

لوگ جو دہر کمانے میں لگے ہیں ارشد
ہم نے اک شخص پہ دنیا ہے یہ واری ساری

ارشد محمود ارشد

ایک سازش کسی نے کی ساری
بات بنتے بگڑ گئی ساری

دوش کچھ آپ کا نہ تھا میرا
دونوں سمجھے نہ ان کہی ساری

کوئی کردار بولتا ہی نہیں
داستاں کس طرح گھڑی ساری

رفتہ رفتہ دباؤ میں آ کر
ڈور پل میں الجھ پڑی ساری

وحشت مجھ کو سلام کرتا ہے
ریت میں نے بھی ہے چھنی ساری

اب کہ ڈھیروں وضاحتیں ہونگی
اس نے آدھی سنی کہی ساری

گرد اڑنا تو تھی یونہی ارشد
جب ہوا تیسرے نے دی ساری

غزل

محیطِ گنبدِ امکان کو ٹٹول کے دیکھ
ستارہ گہہ کے مجاور، کواڑ کھول کے دیکھ

بدن کی راکھ اڑانے سے قبل بس اک بار
یہ روشنی کی کرن عطرداں میں گھول کے دیکھ

بچے نگاہ جو فرسودگی کی قُمچی سے
تو اسپِ فکر کی رفتار اس میں تول کے دیکھ

نہ جانے کوچ ہو کب چاہ تار کی جانب
ابھی سے راستے سارے، بلیک ہول کے دیکھ

مِلے جو طبل کی آواز دل کی دھڑکن سے
لہو میں زمزمے نوبت کے اور ڈھول کے دیکھ

بڑھا کے تیز قدم کوہِ قاف کی جانب
ہزار رنگ پری زادیوں کے غول کے دیکھ

بس ایک لمس کی گرمی سے لوحِ روشن پر
مکاشفے ہیں عجب، پیکرِ سڈول کے دیکھ

یہ حرف و اسم ملے باغِ آفرینش سے
اور اب یہ حکم کہ اپنی زباں سے بول کے دیکھ

عابد رضا

غزل

میتھیو محسن

نہ جانے کیوں ہے یہ دل بے قرار کیا کہیے
خوشی ہی راس نہ غم ساز گار کیا کہیے

تمام رات ستاروں نے خون چھڑکا ہے
کیا ہے کیسے ترا انتظار کیا کہیے

ہر ایک یاد سے زخموں کے پھول کھلتے ہیں
تباہ دل کے چمن کی بہار کیا کہیے

ہجوم جلوۂ رنگیں میں کھو گئی ہے نظر
بہار حسن کا دل کش نکھار کیا کہیے

یہ کس مقام پہ چھوڑا ہے زیست نے محسن
نہ کوئی غم نہ کوئی غم گسار کیا کہیے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

غزلیں

جس کو چاہا کبھی مِلا تو نہیں
زندگی یہ تِری سزا تو نہیں

جانے کِس موڑ پر بچھڑ جائے
ہم سفر نے ابھی کہا تو نہیں

ہم مسافر ہیں ، آخرِ شب کے
چل پڑیں ، کب ، کہیں ، پتا تو نہیں

کوئی ویران کر گیا ہے شہر
لوگ کہتے ہیں کچھ ہوا تو نہیں

یہ مِرا گھر ہے یا کوئی صحرا
پھول آنگن کوئی کِھلا تو نہیں

وہ جو کب کا بچھڑ گیا یوسف
شہرِ جاں سے ابھی گیا تو نہیں

محمد یوسف

شور ایسا مری بستی کی فضا چاہتی ہے
ایک دنیا بھی سُنے ، ایسی ندا چاہتی ہے

زخم اِتنے ہیں کہ اَب، درد سنبھل پاتا نہیں
اور محبت ہے کہ پھر مجھ سے وفا چاہتی ہے

آخری سانس کا یہ پھول مرے ہاتھ میں ہے
چارہ گر! خلقِ خدا تجھ سے دوا چاہتی ہے

چل پڑی ہے یہ کہاں دیس کی بیٹی یوسف
اُس سے بستی تو مری شرم وحیا چاہتی ہے

غزل

وہ جب گیا تو روشنی بھی ساتھ لے گیا
آنکھوں کا نور، تیرگی بھی ساتھ لے گیا

اس کے بغیر زندگی بے رنگ ہو گئی
وہ دشمنی بھی، دوستی بھی ساتھ لے گیا

اب کیسے ہو گی شام، کٹے گی یہ رات کیا!
وہ روز و شب کی تشنگی بھی ساتھ لے گیا

میرے لیے وہ چھوڑ گیا خواب سی تھکن
دیوار پر لگی گھڑی بھی ساتھ لے گیا

آگے ہی بڑھ سکوں نہ میں پیچھے ہی ہٹ سکوں
وہ ربط و ضبطِ آگہی بھی ساتھ لے گیا

اُس کے بغیر میں تو کسی کام کا نہیں
جاتے ہوئے مری چھڑی بھی ساتھ لے گیا

کیسے کہوں حبیب اسے دیکھے بِنا غزل
وہ حرف حرف آذری بھی ساتھ لے گیا

بشیر احمد حبیب

غزل

میں ادھورا رہا نامکمل رہا
تیرے تیرِ نظر سے ہی گھائل رہا

تیرے سپنوں میں الجھا رہا رات بھر
دیکھ لو پھر بھی دن بھر میں بے کل رہا

وہ جو صدیوں سے ہے میرے دل میں مکین
آج تک میری نظروں سے اوجھل رہا

سخت ویران ہے میرے دل کا نگر
ورنہ چاروں طرف ایک جل تھل رہا

ساتھ چلتے رہے مل نہ پائے کبھی
ایک دریا تھا دونوں میں حائل رہا

میں جھلستا رہا ہجر کی دھوپ میں
تیری چاہت کا مجھ پر نہ بادل رہا

بن کہے تو نے مجھ پر عنایات کیں
تیرا احسان مجھ پر مسلسل رہا

محمد اشفاق بیگ

غزل

حاصل اگر نہ ساتھ ہو تیری دُعاؤں کا
کوئی اثر نظر نہیں آتا دواؤں کا

ہر اک عمل کا ہوتا ہے ردِ عمل کوئی
تیری جفا نتیجہ ہے میری وفاؤں کا

اچھوں کی اچھی بات ہے ہر ایک کے لیے
مالک درخت ہوتا نہیں اپنی چھاؤں کا

یک طرفہ ہوں تو پھر نہیں چلتی محبتیں
پھر بھی اگر چلاتی ہیں، دل دیکھو ماؤں کا

سر پر کبھی بٹھانا ، کبھی پوچھنا نہیں
نعمان تو اسیر ہے تیری اداؤں کا

نعمان محمود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ میں نہیں ، مرا پَرتَو نہیں ، یہ میں تو نہیں
گماں سا کیوں مجھے گزرا؟ کہیں یہ میں تو نہیں

غزل

آنکھ میں جو یہ خواب رکھا ہے
اک مسلسل عذاب رکھا ہے

عشق ریگِ رواں کی صورت ہے
ہر قدم پر سراب رکھا ہے

صرف پگڑی نہیں ہے پیروں میں
ساتھ سر بھی جناب رکھا ہے

میرے ہنسنے کا ، میرے رونے کا
اس نے سارا حساب رکھا ہے

وحشتِ عشق نے مِرے دل کا
سارا خانہ ، خراب رکھا ہے

وصل میرا سوال تھا مہدی
ہجر اس نے جواب رکھا ہے

غضنفر مہدی

غزل

یہ مانتا نہیں کہ محبت نہیں ہوئی
شاید اسے نصیب فراغت نہیں ہوئی

مصرع سمجھ کے میں نے اٹھا تو لیا اسے
مشکل زمین تھی سو ریاضت نہیں ہوئی

مقصود دستِ یار پہ طعنہ زنی نہیں
کیوں ایک زخم پر ہی قناعت نہیں ہوئی

ایسا بھی کوئی اجنبی ملنا محال ہے
خود سے ملا ہوں اور مجھے وحشت نہیں ہوئی

ہنستے رہے ہیں دامنِ صد چاک پر رفیق
محسوس ہی رفو کی ضرورت نہیں ہوئی

لائیں کوئی ثبوتِ اطاعت ہی سامنے
کہتے جو ہو جہاں سے بغاوت نہیں ہوئی

کن حیرتوں سے اور ملائے گی زندگی !
اس سے ملا ہوں اور مسرت نہیں ہوئی

یوں ہی تو بھر نہیں گیا ہے دل بہار سے
کیسے کہوں کہ مجھ پہ عنایت نہیں ہوئی

جاذب عروج جا کے پلٹتا بھی کس طرح
حاصل ہمیں زوال سے عبرت نہیں ہوئی

اکرم جاذب

غزل

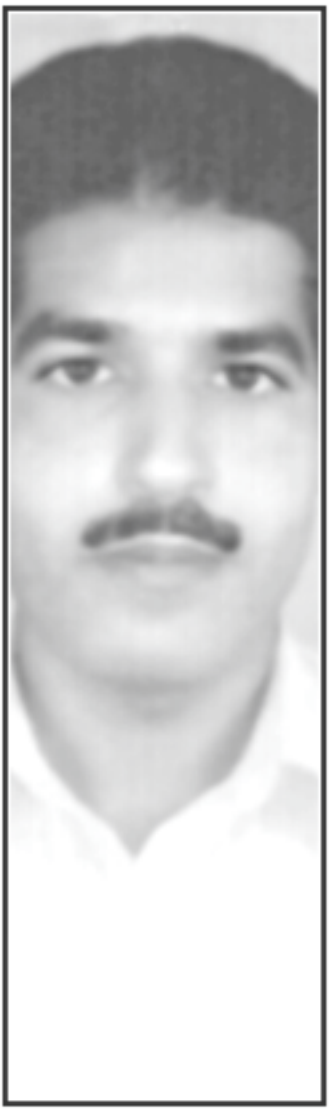

یہ الگ بات کہ ہر پل مجھے ٹالا ہو گا
پھر بھی ہر شعر ترے ہجر کا نالہ ہو گا

آج بھی بھوکے ہی مزدور کے بچے سوئے
کل پہ اُجرت کو کسی شخص نے ٹالا ہو گا

تجھ کو کیا علم بچھڑتے ہوئے تجھ سے میں نے
کیسے کیسے دلِ مُضطر کو سنبھالا ہو گا

کر کے رُسوا مجھے صحرا میں جو لے آئی ہے
زندگی یہ بھی ترے بُخض کا چالا ہو گا

ظلم دیکھیں گے مگر بول نہیں پائیں گے
یوں سبھی لوگوں کے ہونٹوں پہ ہی تالا ہو گا

میر و غالب کے ابھی تم کرو جوتے سیدھے
پھر کہیں شعر کی دنیا میں حوالہ ہو گا

سرور فرحان

غزل

عاصم بخاری

جتنا بھی پیار ، فیس بک پر ہی
یار دل دار ، فیس بک پر ہی

قول اقرار ، فیس بک پر ہی
سارے اظہار ، فیس بک پر ہی

سچ تو یہ ہے کہ مرنے والوں کا
اب ہے دیدار ، فیس بک پر ہی

ہو محبت کا ، یا کہ نفرت کا
اب تو اظہار ، فیس بک پر ہی

ویسے تو ملنا کب نصیبوں میں
آنکھیں بھی چار فیس بک پر ہی

پگڑیاں بھی اچھلتی دیکھیں یاں
عزتیں تار فیس بک پر ہی

وقت پڑنے پہ وا ہوا عقدہ
یاروں کے یار فیس بک پر ہی

آمنے سامنے ، کہاں عاصم
جیت اور ہار فیس بک پر ہی

غزل

کوکی گل

کڑی سی دھوپ میں تو، دل مرا گھبرا گیا ہے
مرے آنچل کا سایا میرے من کو بھا گیا ہے

ترے لہجے کے خنجر نے، مرا دل چیر ڈالا
یہی اک روگ ہائے! میرے دل کو کھا گیا ہے

نجانے کیا تھا اس کے دل میں جو بولا نہیں پر
وہ باتیں کرتے کرتے ایک دم شرما گیا ہے

سلامی دے رہے ہیں پھول پودے آج گل کو
کوئی نقشہ بہاروں کا، انہیں دکھلا گیا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر سخن تھا ہم اہلِ غم کے لیے
دل شکن ، دل خراش ، دل آزار

غزل

اسد رضا سحر

تو اگر ہم نشین ہو جائے
زندگی پر یقین ہو جائے

آسماں بعد کی کہانی ہے
پہلے میری زمین ہو جائے

آنکھ پر بھی کریگا پی ایچ ڈی
آشنائے جبین ہو جائے

پھونک پڑھ پڑھ کے سورۂ یوسف
تاکہ بیٹا حسین ہو جائے

اسکو مسند پہ بھی بٹھائیں گے
قابلِ آستین ہو جائے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

غزل

مہتابِ نیم ، زرد ستارہ دکھائی دے
کوئی تو خاکدان پہ ایسا دکھائی دے

کچھ اس لیے بھی ہم اسے ملنے نہیں گئے
برسوں کے بعد جانے وہ کیسا دکھائی دے؟

کیسی بہار آئی کہ صحنِ چمن میں آج
ہر اک گلاب عکس اسی کا دکھائی دے

یونہی ٹہلنے گلیوں میں آتے رہیں یہ لوگ
یونہی یہ ماہتاب دمکتا دکھائی دے

کیا کیا نہ دیکھنے کی تمنا رہی مگر
دنیا پہ اک نگاہ سے کیا کیا دکھائی دے!

مہر علی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل دھڑکنے پہ بھی آمادہ نہ پایا خالد
ہر نفس گوش بر آواز خدا اپنا تھا

غزل

تم نے دیکھا ہے جسے وہ مری پرچھائی ہے
اس سے بڑھ کر کوئی وحدت ہے نہ سچائی ہے

اس لیے خال زمانے سے جُدا ہیں میرے
ان کو کیا علم کہ مٹی مری صحرائی ہے

پہلے سرسبز بہاروں کے یہاں پھیرے تھے
اب وہی حجرہ ہے اور چاروں طرف کائی ہے

ایک مصرعے نے بدل ڈالی ہے رنگت اُس کی
وہ جو کہتا تھا غزل قافیہ پیمائی ہے

کوچۂ قلب میں آ جاؤ کسی روز اگر
کوئی گہرائی ہے اس سمت، نہ اونچائی ہے

پوچھتے کیا ہو مری عمرِ رواں کا قصہ
میں ہوں اور برسوں پہ پھیلی ہوئی تنہائی ہے

شعر کے ساتھ کسی طور نہیں ہیں مخلص
جن کا مقصود ہی دُنیا میں پزیرائی ہے

مستحسن جامی

غزلیں

ناز نخروں سے جو پلی ہوئی ہے
اسی پاگل سے دل لگی ہوئی ہے

پاؤں زخمی ہوئے ہیں پانی میں
کیسی نادان زندگی ہوئی ہے

آپ سے کوئی واسطہ نہیں تھا
آپ نے پھر بھی بات کی ہوئی ہے

شہر میں نام گونجتا ہے مرا
آپ سے جب سے دوستی ہوئی ہے

پھول ، اور سنگ و خشت ہیں یکجا
آئنے میں نظر کری ہوئی ہے

رنگ تتلی کے ہو گئے مدھم
چاند پر آنکھ جم گئی ہوئی ہے

میری چادر میں چھید تھے پھر بھی
آپ نے سر پہ وہ تنی ہوئی ہے

ندیم ملک

جیسے میں کر رہا ہوں تری بات گول مول
کرتا ہے کوئی ایسے بھی جذبات گول مول

فی الحال تنگ دست ہوں اور بے شمار ہوں
فی الحال مت دکھایئے حالات گول مول

کردار ہی نہیں ہے کہانی میں اب کی بار
رکھو نہ اب کی بار ملاقات گول مول

اچھا ہوا جو تو نے مجھے چھوڑ ہی دیا
ویسے بھی کر رہا تھا میں ہر بات گول مول

لایا گیا تھا کھینچ کے اس واسطے ندیم
مقتل میں آ رہا تھا کوئی ہات گول مول

غزل

دریا کنارے بیٹھا بھی پیاسا لگا مجھے
میلے میں آ کے بھی کوئی تنہا لگا مجھے

مسکاں منافقت کی مرا دل جلا گئی
دشمن کا منہ پہ بولنا اچھا لگا مجھے

ہر سانس جیسے وجہِ شکستِ وجود ہے
ہر لمحہ ایک گھن کی طرح سا لگا مجھے

جیسے ٹریڈمل پہ ہوں اور چل نہیں رہا
ایسا بھی ہو رہا ہے کچھ، ایسا لگا مجھے

آتا گیا قریب تو کھلتا چلا گیا
اک شخص جو کہ دُور سے اچھا لگا مجھے

دیکھا اُسے جو پیار کا چشمہ اتار کر
اِتنا بڑا نہیں تھا وہ جتنا لگا مجھے

بے وجہ کا مبالغہ اچھا نہیں میاں
جو جس قدر بلند تھا، اُتنا لگا مجھے

وہ جسم سے قریب تھا پر روح سے نہیں
دلشاد ساری عمر جو اپنا لگا مجھے

دلشاد احمد

غزلیں

اشوک و پورس و گوتم کی سرزمین سے میں
حضور آپ کا خادم ہوں منکرین سے میں

سنہری جالیاں چھوتا ہوں اور سوچتا ہوں
ملے بغیر چلا جاؤں گا مکین سے میں

قسم ہے شانِ کریمی کی کبریائی کی
لپٹ کے رو نہیں پڑتا مرے امین سے میں

حضور آپ کی سیرت مطالعہ ہے مرا
حضور ڈرتا نہیں ہوں کسی لعین سے میں

حضور امتیں جس روز ساری جمع ہوئیں
تو صاف جان لیا جاؤں گا جبین سے میں

اڑن کھٹولے پہ نکلا حجازِ اقدس کو
فلک پہ آ گیا ہوتا ہوا زمین سے میں

عقیل عباس

سانپ نے غار میں رہائش کی
اور دیدار کی گزارش کی

سبزگی نے غلاف کاڑھ لیا
اور نعلین کی ستائش کی

پیش رو بارگاہ میں پہنچے
یعنی بارِ دگر سفارش کی

کوئی کاریز احمدِ مرسل
زیرِ پائے مراد بخشش کی

عالمِ سکر میں بھی ہونٹوں نے
مدحتِ مصطفیٰ میں جنبش کی

غزلیں

اس بار ہاتھ تھام کے موقع پرست کا
دیکھا ہے خواب رینگنے والے نے جست کا
نزدیک آ چکی ہے وہ آواز دور کی
اب وقت ہی کہاں ہے کسی بندوبست کا
بہتر یہی کہ خود سے کیے جاؤں میں ادھار
احسان کیوں اٹھاؤں کسی چیرہ دست کا
آتا ہوں اس طرف بھی تماشہ تو دیکھ لوں
وعدہ ہر ایک یاد ہے یوم الست کا
اس بار آئینہ ہے مقابل سو خود کو میں
عادی بنا رہا ہوں ابھی سے شکست کا

علی تاصف

کام حرص و ہوس کا تھوڑی ہے
عشق ہر اک کے بس کا تھوڑی ہے

وہ مری دسترس میں ہے لیکن
مسئلہ دسترس کا تھوڑی ہے

آہ ، آزاد چھوڑ دے کہ میاں
یہ پرندہ قفس کا تھوڑی ہے

تا بکے سر پہ آسمان اُٹھائیں
ہجر یک دو نفس کا تھوڑی ہے

سچ جس کو ناگوار ہو اٹھ جائے شوق سے
حامی نہیں فقیر بھی ایسی نشست کا
حالت تو دیکھ اٹھ کے در و سقف و بام کی
اب آگے آ رہا ہے مہینہ اگست کا
فضل و کمال و علم و ہنر ذوق و آگہی
طے کرتے ہیں مقام بلند اور پست کا
اس نے ہر اک سوال کا الٹا دیا جواب
تاصف مرید ہو کے اٹھا بادہ مست کا

اب تو بس صُور پھونکئے کہ یہ کام
اب صدائے جرس کا تھوڑی ہے

اپنی تنہائی چھوڑ دوں کیوں کر
ساتھ اک دو برس کا تھوڑی ہے

جست بھرنے کا وقت ہے تاصف
وقت یہ پیش و پس کا تھوڑی ہے

غزل

کچھ اضطراب ہے تو ذرا پیچ و تاب ہے
یوں ہی دلِ خراب کا خانہ خراب ہے

ناکام وصل ہے جو وہی کامیاب ہے
اتنا سا اس فسانے کا لبِ لباب ہے

اب اور کوئی زندگی جیتے نہیں ہیں ہم
ہے زندگی وہی کہ جو اثنائے خواب ہے

سمجھا ہمیں کو ظلم کے قابل تو تہنیت
سارے جہاں سے اچھا ترا انتخاب ہے

اس دشت میں لگا تھا سرِ آب جو مقام
پاس آ کے یہ کھلا وہ کنارِ سراب ہے

توقیر دے کے جس نے بھی دنیا خرید لی
ثاقب وہی تو شہر میں عزت مآب ہے

حسین ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آفاقِ ماہ تاب کہاں ، کنجِ دَر کہاں
ٹِکتا ہے آسماں کا دیا طاق پر کہاں

غزلیں

رہی زندگی میں وہ فرصت کہاں
سنورتی ہے ہر لمحہ صُورت کہاں

گزرتے ہیں دن رات وحشت میں اب
مرے! دل میں پہلی سی چاہت کہاں

ہوئے راستے بھی ہمارے جدا
کہاں اب میسر وہ قربت کہاں

غرض کے پجاری ہیں سارے، یہاں
خلوص و وفا کی اجازت کہاں

ہوائیں تو چلتی ہیں اب بے سبب
انھیں اب چراغوں سے نفرت کہاں

یہ اک بے وفا کا وفادار ہے
کروں زین دل کی شکایت کہاں

عبدالرؤف زین

ویسے مالک سے یہ شکوہ تو نہیں بنتا ہے
نوجواں بیٹے کا مرنا تو نہیں بنتا ہے

رب نے بتلایا کہ میں ہوں مرے موسیٰ ورنہ
اس طرح پانی میں رستہ تو نہیں بنتا ہے

روز کچھ خواب مری آنکھ میں مر جاتے ہیں
تم یہ کیوں کہتے ہو؟ کتبہ تو نہیں بنتا ہے

گر بناؤں تو اُمڈ آتی ہیں آنکھیں میری
کینوس پر ترا چہرہ تو نہیں بنتا ہے

دل بھی پاگل ہے، کہیں پر بھی مچل جاتا ہے
ورنہ کچھ لوگوں پہ مرنا تو نہیں بنتا ہے

نعمان فلک

غزل

جو کوئی وقعتِ تجدید سمجھتا ہی نہیں
میں اُسے قابلِ تقلید سمجھتا ہی نہیں

آج کے دور کا انسان بہت ضدی ہے
کُھل کے کرتے رہو تنقید، سمجھتا ہی نہیں

وہ ترے دل میں چُھپی بات کہاں سمجھے گا؟
جو ترے لفظوں کی تعقید سمجھتا ہی نہیں

کوئی بھی بات طوالت سے بُری لگتی ہے
میں کسی قسم کی تمہید سمجھتا ہی نہیں

تیرے ہونے کا گماں، دل کو جواں رکھتا ہے
تو کہ اِس بات کو بے دید! سمجھتا ہی نہیں

اُن کو تہوار مبارک جنھیں سب حاصل ہے
یار تو یار سوا عید سمجھتا ہی نہیں

جو ترا حکم ملا، فوری اُسے پورا کِیا
دل تری بات کی تردید سمجھتا ہی نہیں

ثمر جمال

غزل

عمر بھر ایک شرر یاد آیا
ایک جلتا ہوا گھر یاد آیا

ہر طرف خاک مرے اُڑنے لگی
جب بھی وہ دشت وہ سر یاد آیا

میں کہاں اس کو بھلا بھول سکا
ہاں تکلف سے مگر یاد آیا

جب بھی آیا مجھے دنیا کا خیال
ایک ممنوعہ شجر یاد آیا

سن کے ہوتا ہے تعجب مجھ کو
آرزو آپ کو گھر یاد آیا

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیازمند ہیں ، ایک اگر نہیں تو کیا

غزل

المدد پکارتے سانپ کی طرح میں تھا
سر زمیں پہ مارتے سانپ کی طرح میں تھا

تیغِ عشق نے کیا تن مرا دو نیم جب
الاماں پکارتے سانپ کی طرح میں تھا

عشق جب تھا کر رہا دوسرا میں آپ سے
کینچلی اُتارتے سانپ کی طرح میں تھا

جب ہجومِ اشقیا پل پڑا تھا مجھ پہ آہ
ظلم کو سہارتے سانپ کی طرح میں تھا

عارضِ جمال پر جب تلک تھا پہرہ دار
زُلف کو سنوارتے سانپ کی طرح میں تھا

سرفراز عارض

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے مہرِ کرم چمکایا
پگ پگ دھوپ کا ہُن برساتا

غزلیں

عشق کا دیکھا ہے اثر میں نے
دل پہ جھیلا ہے اک غدر میں نے

درد سے کر لی دوستی آخر
جب نہیں پایا چارہ گر میں نے

ایک فیضِ نگاہِ یار ، تجھے
کتنا ڈھونڈا ہے دربدر میں نے

یہ الگ بات ، خود ہوا رُسوا
تُجھ کو رکھا ہے مُعتبر میں نے

یہ محبت کی چھاؤں بانٹے گا
جو لگایا ہے یہ شجر میں نے

ایک شاعر کی چاہتیں دے کر
کر دیا ہے تمھیں امر میں نے

سوگ دل کا تھا چار دن کا ادیب
اور نبھایا ہے عمر بھر میں نے

محمد علی ادیب

آپ اک بار مرے گاؤں میں گر آ جائیں
جتنے ہیں بانجھ شجر سب پہ ثمر آ جائیں

تم نے اک بار بلایا ہی نہیں ہے ورنہ
ہم تو اک بار بلانے پہ ہی گھر آ جائیں

ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں ہم اس دن سے
تم نے جس دن یہ پکارا تھا کہ سر! آ جائیں

پہلا دن جامعہ کا خالی نہ تھی کوئی نشست
پھر کسی نے یوں بلایا تھا : ادھر آ جائیں

حیدر بخاری

مسلسل غزلیں [تیسرا پڑاؤ]

کنارِ جھیل کوئی مَن چلا تھا
مَیں تھوڑی دور ٹھہرا دیکھتا تھا

حصولِ رزق میں گھر سے یہ دوری
مرا تو دل ہی بیٹھا جا رہا تھا

سفر میں آتے جاتے منظروں سے
مَیں، بیٹھا تیری باتیں کر رہا تھا

کہیں کوئی ، کہیں کوئی تقاضا
مَیں کیا بتلاؤں ، کتنا تھک گیا تھا

کوئی قرنوں سے بیٹھا ہے اکیلا
خدا معلوم! ایسا کیا ہُوا تھا

جدائی کے الگ سے سلسلے ہیں
وصالِ دوست ، اُس میں خیر کیا تھا

نوید اِن منزلوں تک آتے آتے
میں اپنے راستے سے ہٹ گیا تھا

مجھے گمراہ کر رکھا تھا دل نے
کسی امکان نے اندھا کیا تھا

ذرا تسکینِ دل سی ہو گئی تھی
کسی کا اِس میں آخر کیا گیا تھا

یہ گرد و پیش تو میرے نہیں تھے
یونہی ماحول سا بننے لگا تھا

کہیں ماں باپ کی شفقت فراواں
کہیں مجبوریوں کا سامنا تھا

کوئی لائے ذرا تمثال ایسی
میں اپنے سامنے گم صم کھڑا تھا

مَیں ظالم تھا، چھپا جاتا تھا سب کچھ
اُسے کس دن کوئی شکوہ رہا تھا

مَیں برسوں بعد بیٹھا سوچتا ہوں
نمی تھی آنکھ میں؟ وہ خوں تھا؟ کیا تھا؟

.....

خموشی کا الاؤ بجھ گیا تھا
مَیں اپنے حاشیے میں گھومتا تھا

تجھے اب کیا بتاؤں ، کیا ہوا تھا
سمندر تھا کہ بس بپھرا ہوا تھا

کسی آئینے میں ہمت کہاں تھی
مرا خود سے مسلسل سامنا تھا

بچھڑتے وقت اس کو چپ لگی تھی
مرا بھی حال ابتر ہو رہا تھا

ادب آداب سے عاری زمانہ
مری رہ میں رکاوٹ بن رہا تھا

سرِ قرطاسِ دل زندہ ہوں ، لیکن
میں برسوں پہلے، شاید مر گیا تھا

اُسے معلوم ہی کب ہے کہ مَیں نے
اُسے خود سے جدا رکھا ہُوا تھا

وہی بچپن ، جوانی اور دنیا
کوئی جھگڑا مسلسل چل رہا تھا

اُسے اپنی فقط اپنی پڑی تھی
دل بیدار خدشوں میں گھرا تھا

کوئی اب اُس کو جا کر یہ بتا دے
نوید اُس حال میں بھی خوش رہا تھا

.....

بچھڑنے کا زمانہ آ گیا تھا
کتابوں سے لگاؤ بڑھ رہا تھا

کہیں تو تھا ، کہیں تو بھی نہیں تھا
بڑی آسانیوں میں جی رہا تھا

مرے جذبات کا جو خوں بہا تھا
تری دیوار تک پھیلا ہُوا تھا

تماشا در تماشا مَیں اکیلا
کسی گمنام گوشے میں پڑا تھا

تری دیوار سے رغبت کا قصہ
مجھے کچھ کچھ ادھورا لگ رہا تھا

زمیں حیرت سے مجھ کو دیکھتی تھی
فلک کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا

نوید اِک واردات دل کا چرچا
مرے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا

نوید صادق

غزل [خود اپنے لیے]

تقطیع کرو حرف چنو بحر بناؤ
بہہ جائیں جس میں غم بھی کوئی لہر بناؤ

اے ساکنانِ ارضِ بقا ملتمس ہوں میں
مجھ جیسے فانی شخص کا بھی شہر بناؤ

بے رنگ سے اس دن کو کسی رنگ میں ڈھالو
ممکن نہ ہو تو ایسا کرو قہر بناؤ

ہم ملنے کے مشتاق ہیں اک شام میں تم سے
گر شام نہیں بنتی تو دوپہر بناؤ

ہر جسم سے گرتی ہوئی مٹی کو سمیٹو
پھر اپنے لیے سب سے الگ دہر بناؤ

لے جاؤ میرے لوح و قلم رنگ سمیٹو
جو میں نہ بنا پایا وہی سحر بناؤ

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ مجھ کو چھو کے گزرتا چلا گیا خالد
مہک رہا ہے جو مجھ میں، کہیں یہ میں تو نہیں

گیت

[زیرِ طبع پنجابی ناول ''بول مٹی دیا باویا'' کے ایک باب کا اردو ترجمہ]

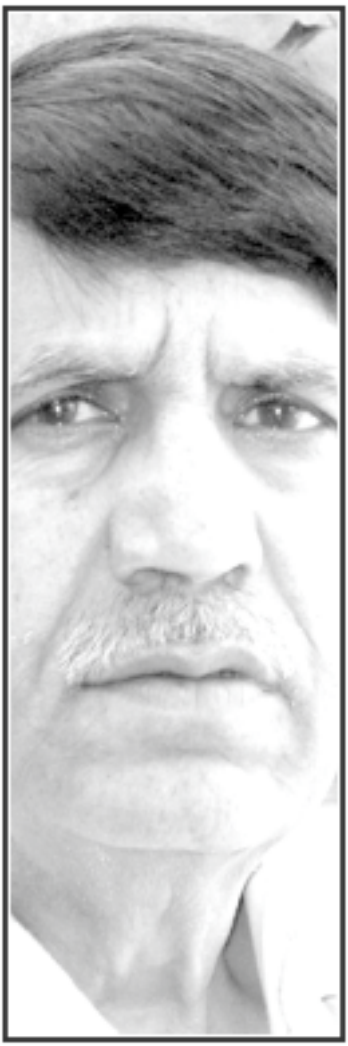

اسلام عظمی

اُونٹوں کے واڑے کو دیکھتے ہی شعبان کا دھیان ''بول بول مٹی دیا باویا وے'' والے گیت کی طرف چلا گیا۔ وہ راتوں میں کئی بار بہت دور کسی کو یہ گیت گاتے ہوئے سن رہا تھا۔ اُونٹوں اور ساربانوں کے ساتھ گیتوں کی کئی کہانیاں جڑی ہوئی تھیں۔ بیابانوں میں سفر کرتے ساربانوں آپ ہی آپ کوئی گیت گانے لگتے۔ سناٹے میں آواز گونجتی تو تنہائی کا احساس کم ہو جاتا۔ آواز چاہے اپنی ہی کیوں نہ ہو تنہائی کا احساس مٹا دیتی ہے۔

''گیت گانے والا کہیں اس واڑے میں تو نہیں رہتا''..... یہ خیال شعبان کے دماغ میں آسمانی بجلی کے کوندے کی طرح چمکا اور شعبان کے قدم بے سوچے اونٹوں کے باڑے کی طرف بڑھنے لگے۔ باڑے کا پھاٹک کھجور کے پتوں سے بنا ہوا تھا اور جھریوں میں سے اندر دیکھنا ناممکن نہ تھا۔ شعبان نے ایک جھری سے آنکھ لگا کر اندر جھانکا۔ وسیع و عریض باڑے میں گاف کے درختوں کے آس پاس کئی اونٹ کھلے پھر رہے تھے۔ ایک نکر میں ایک چھپرا تھا اور چھپرے کے نیچے کچھ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک

چارپائی پر وہ کسی کو لیٹا یا سویا ہوا بھی دیکھ سکتا تھا۔ تجسس کے تحت شعبان نے واڑے کے پھاٹک کو دھکیل کر اندر جانے کی گنجائش پیدا کی اور چھپرے کی طرف چل پڑا۔ سوئے ہوئے آدمی کے پاس پہنچ کر ایک زوردار کھنکھورا مارا۔ سونے والا ہڑبڑا کر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو مسل کر شعبان کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا مگر جسے پہلے کبھی دیکھا نہ ہو اسے کیسے پہچانا جا سکتا ہے۔ پھر اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔

''یا اَخی (عربی زبان میں بھائی)۔ کیا کوئی مشکل ہے؟''

''کوئی مشکل نہیں۔ میں سڑک پار والے ایک کیمپ سے آیا ہوں۔ رات کو کسی کے گیت گانے کی آواز سنائی پڑتی ہے۔ گیت گانے والے کو ملنا چاہتا ہوں۔ تم اگر اسے جانتے ہو تو مجھے اس سے ملوا دو۔''

''گیت گانے والا تو میں ہی ہوں۔''

''تم!''.....شعبان نے کہا۔ اُسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سامنے والے کا قد کاٹھ لبنانیوں اور مصریوں جتنا تھا۔ نین نقش یونانیوں کی طرح کے تھے۔ بال سوڈانیوں اور صومالیوں جیسے تھے۔ چمڑی کی چٹیائی گوروں جیسی تھی۔ اُس نے میلا عربی کندورا پہنا ہوا تھا۔ لہجہ البتہ پاکستانیوں اور ہندوستانیوں جیسا تھا۔

''یہ کیا کہانی ہے''.....شعبان نے پھر اپنے آپ سے سرگوشی کی۔ وہیں کھڑے کھڑے وہ صدیوں پہلے کے زمانے میں پہنچ گیا۔ تاریخ میں ایسی اَن گنت کہانیاں تھیں۔ قلوپترہ مصرن تھی اور جولیس سیزر یونانی۔ ان دونوں کے خدوخال الگ تھے۔ بولیاں الگ تھیں۔ اگر اُن کی کوئی اولاد ہوتی تو کیسی ہوتی!''

پنجاب کی کہاوت تھی کہ سو دو سو کوہ کے فاصلے پر لہجہ بدل جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ بھوک کے ہاتھوں قومیں نقل مکانیاں کرتی رہی ہیں۔ چیزوں کے تبادلے کے لیے تاجر ملکوں ملکوں خوار ہوتے رہے ہیں۔ ایک انگریز سات سمندر پار کر کے ایک مغل شہزادی کا علاج کرنے کے لیے دہلی پہنچ گیا تھا۔

بیسویں صدی میں ایک لکھاری کرشن چندر نے ایک کہانی ''دس کا نوٹ'' اس بارے لکھی تھی۔ شعبان کھڑے کھڑے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ ایک اونٹ دوڑتے ہوئے اُن کے پاس آ پہنچا تو شعبان جیسے کوئی خواب دیکھتے ہوئے جاگ گیا۔ اُس نے کندورے والے کو پوچھا۔

''تم پاکستانی ہو؟''

''نہیں۔''

''ہندی!''

''نہیں۔''

''عربی؟''

''نہیں۔''

''صومالی سوڈانی!''

''نہیں۔''

کچھ دن پہلے شعبان نے سانڈرانا میں ایک جرمن عورت کو دیکھا تھا۔ سامنے والے کے خدوخال بہت حد تک اس سے ملتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ سانڈرا کے بال سیدھے اور اس کے گھنگھریالے تھے۔ دونوں کی آنکھوں کا رنگ بھی فرق تھا۔ اس خیال کے ساتھ شعبان کو آنکھوں کے رنگوں کے بارے میں باتیں یاد آنے لگیں۔

کالی آنکھیں کہتی ہیں کہ ہم سے پیار کرو، ورنہ ہم مار دیں گی۔

نیلی آنکھیں کہتی ہیں کہ ہم سے پیار کرو ورنہ ہم مر جائیں گی۔

سامنے والے کی آنکھیں بھوری تھیں۔

شعبان نے سنا تھا کہ بھوری آنکھوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ شعبان کے سارے اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ بالآخر زچ ہو کر پوچھا۔

''پھر تم کیا بلا ہو؟''

''پتا نہیں۔ ماں کو پتا ہوگا۔''

''ماں کہاں ہے۔''

''رب کے پاس''..... یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی۔ پھر بولا۔

''رب دے بھید رب ہی جانے۔ میں کون ہوں، یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ میرا کام اونٹوں کے پیچھے بھاگنا ہے۔ اونٹ بہت شرارتی ہوتے ہیں۔ اونٹوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے عقل جواب دے جاتی ہے۔ میرا کوئی نام بھی نہیں ہے۔ اونٹوں کے پیچھے بھاگنے والوں کا نام نہ ہونے سے اونٹوں کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ زندہ رہنے کے لیے نام کی نہیں روٹی کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ مجھے مل جاتی ہے۔ میرے ساتھیوں نے میرا نام باوا نہ رکھا ہوتا تو نام ہونا ہی نہیں تھا۔ مجھے نام کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کب اپنے آپ کو پکارنا ہے۔ آپ سیانے لگتے ہو مجھے یہ بتاؤ کہ ''باوے'' کا کیا مطلب ہے!''

شعبان سوچوں میں ڈوب گیا۔ اسے ایسا لگا کہ سامنے والا انتہائی مکار اور چالاک ہے مگر جب باوے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی تو شعبان سٹ پٹا گیا اور اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شعبان نے باوے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

''باوے، تم یہ دکھ کہاں سے اکٹھے کر لیے ہیں۔''

''رب جانے۔''

''گیت کے بول تم نے کہاں سے سیکھے۔''

''ساتھیوں نے سکھائے تو یاد ہو گئے۔ میں یہ گیت گاتا ہوں تو میرے سینے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ گیت کے بولوں میں کوئی کھینچ ضرور ہے، جبھی تو آپ واڑے کی طرف کھنچے چلے آئے ہیں۔''

باوے کے آنسو خشک ہو چکے تھے مگر شعبان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ باوا شعبان کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا ''اچھے باوے نہیں روتے۔''

☆☆☆☆☆☆

''انتظار موسم گل''

بات صرف اتنی سی ہے کہ کل شام پانچ بجے عالیہ ہم سب کو چھوڑ کر ایسی جگہ چلی گئی ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ لوگوں کے لیے یہ کوئی اتنی اہم اور خاص بات نہیں۔ کیوں کہ دنیا میں ہر روز ہزاروں لوگ مرتے رہتے ہیں۔ آج ایک شام بیتی ہے پھر نہ جانے کتنی شامیں بیت جائیں گی۔ دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ سورج اسی طرح نکلے گا۔ اندھیری راتوں میں تارے اسی طرح جھلملائیں گے۔ بس مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے دنیا اب محبتوں اور جذبوں سے خالی ہوگئی ہے اور مجھے اب تنہا ہی ان راستوں پر چلنا ہے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں ریحان اب کبھی بھی چاندنی راتوں میں ان سڑکوں پر نہیں گھومے گا۔ ہماری مثلث ٹوٹ چکی ہے۔ مرتے سمے عالیہ کی آواز کی بازگشت ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

''مجھے بچالو میں ابھی مرنا نہیں چاہتی! مجھے تو ابھی ریحان کے ساتھ ایک چھوٹا سا گھر بنانا تھا، جس کے دریچے بگن ویلیا کی بیلوں سے ڈھکے ہوتے، کیاریوں میں موتیا اور نرگس کے پھول کھلکھلا رہے ہوتے اور دور کسی کونے میں ہارسنگھار اور رات کی رانی ہوتی۔''

میں اپنے آنسو ضبط کیے اسے بولنے سے منع کرتا رہا۔

''عالی زیادہ باتیں مت کرو۔''

''نہیں جمیل مجھے مت روکو۔ اماں دیکھو جمیل مجھے باتیں نہیں کرنے دے رہا۔'' اس کی اماں شدت غم سے زرد ہو رہی تھیں۔

''ریحان تم کیوں اتنے خاموش ہو۔ باتیں کرو میرے ساتھ'' آج کیا ساری باتیں ختم ہوگئی ہیں۔''

آپ سوچیں گے اتنی دیر سے میں لایعنی باتیں کیے جا رہا ہوں۔ یہ عالیہ آخر ہے کون؟ سوچا جائے تو عالیہ میری کون تھی۔ میں بتا نہ پاؤں گا۔ کیونکہ بظاہر میرا اس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا اور اگر غور کروں تو وہ بہت کچھ تھی۔ ماں، بہن، دوست، ہمدرد اور غمگسار، اس کے جانے سے میں اتنے رشتوں سے محروم ہوگیا ہوں۔

عالیہ ہرنی جیسی سیاہ آنکھوں اور گھنے لمبے بالوں والی۔ ایک دلکش لڑکی تھی، جس کے

سیما پیروز

چہرے پر حزن نے اسے ایک عجیب ملاحت عطا کی تھی کہ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ بنا میک اَپ اس کے گال سیب جیسے دہکتے رہتے تھے۔

میں جب پہلی بار اس کے گھر گیا تو اس کے چھوٹے بہن بھائیوں نے بیٹھک کو اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ کشن صوفے سے نیچے پڑے تھے۔ اکلوتا گلدان مرجھائے پھولوں سمیت الٹا پڑا تھا - پل بھر کو وہ شرمندہ ہوئی پھر کھسیانی سی ہنسی ہنس دی۔

''یہ سب شریر میرے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ اور یہ میری امی ہیں'' اس نے دیوان پر خاموش اور لاتعلق بیٹھی ایک عورت کی طرف اشارہ کیا اس کی امی کا رویہ مجھے بڑا عجیب لگا۔ میں پندرہ بیس منٹ بیٹھا پھر گھبرا کر بولا ''میرا کمرہ کدھر ہے۔ مجھے بتا دیں۔''

''وہ ادھر باہر کی طرف ہے۔ آیئے آپ کو دکھا دوں۔'' اور میں اس غم ناک سی فضا سے بھاگ آیا۔

میں بطور پے انگ گیسٹ عالیہ کے ہاں رہ رہا تھا۔ اگر کبھی میری طرف سے کرایہ دینے میں تاخیر ہو جاتی تو وہ کبھی تقاضا نہیں کرتی تھی۔ بعض اوقات میری تنخواہ کافی لیٹ ملتی تھی۔ میں جب کبھی شرمندگی سے کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو عالیہ کی دو پُرشفقت آنکھیں میری طرف اُٹھتیں۔ ''کچھ مت کہنا تمھیں تنخواہ ملے گی سارا مع سود وصول کر لوں گی۔'' ریحان اور عالیہ ایک ہی آفس میں ملازم تھے۔ میرا آفس تھوڑے فاصلے پر تھا۔ صبح ہم تینوں آفس جانے کے لیے اکٹھے ہی نکلتے تھے۔ اکثر واپسی بھی اکٹھے ہی ہوتی تھی۔ کبھی کبھار واپسی پر ہم میں سے کوئی کسی سستے سے ہوٹل میں چائے پلا دیتا یا آئس کریم کھلا دیتا تھا۔ یوں ہم تینوں کچھ دیر کے لیے اپنے اپنے دکھوں کے بوجھ کو اتار پھینکتے تھے اور چند گھڑیوں کے لیے خوشی کو اپنے آس پاس محسوس کر لیتے تھے۔ میں بھی ایک یتیم لڑکا تھا۔ بی اے کرتے ہی چچا نے میری ہتھیلی پر پانچ ہزار روپیہ رکھ کر کہا تھا ''جاؤ بیٹا، میری ذمہ داری ختم کماؤ اور کھاؤ۔'' حالاں کہ پہلے بھی میں اپنی پڑھائی کا خرچہ ٹیوشن پڑھا کر پورا کرتا تھا۔

جس روز چچا نے مجھے گھر سے نکالا دنیا میری آنکھوں کے آگے اندھیر ہو گئی تھی۔ جیسا بھی تھا چچا کے ہاں ایک چھت تو میسر تھی۔ اب انھوں نے وہ بھی چھین لی تھی۔

بیکاری کے دنوں میں ریحان سے میری دوستی ہو گئی۔ ریحان نے اپنوں سے بڑھ کر میرا ساتھ دیا۔ اس کے توسط سے ہی مجھے

عالیہ کے ہاں پے انگ گیسٹ کی جگہ ملی تھی۔ عالیہ کو دیکھ کر جینے کا حوصلہ ملتا تھا۔ وہ اتنی باہمت لڑکی تھی کہ میں اور ریحان جب کبھی اپنے حالات سے مایوس ہوتے تو وہ ہمارا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ وہ ہمارے لیے روشنی کی ایسی کرن تھی جو اندھیروں میں راستہ دکھاتی ہے۔

عالیہ کے والد بہت سال پہلے اُن لوگوں کو چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے تھے۔ عالیہ سے بڑا ایک بھائی تھا جو باپ کے بعد اس خاندان کا واحد کفیل تھا۔ ایک روز کوئی گاڑی اس کو کچل کر چلی گئی۔ عالیہ کی امی نے بالکل ہی ہمت ہار دی تھی۔ انھوں نے نیم دیوانگی اور لاتعلقی میں فرار کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اُن دنوں عالیہ نے بی اے پاس کیا تھا۔ اور آگے پڑھنا چاہتی تھی۔

اور اب گزشتہ چھ سات سال سے اس گھر کی گاڑی کو اپنے کمزور ہاتھوں سے کھینچ رہی تھی۔ اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھوگ رہی تھی۔ وہ ننھی سی جان اتنی محنت کرتی تھی کہ بعض اوقات بے حد رحم آتا تھا۔ آفس سے آنے کے بعد گھر کے چھوٹے موٹے سینکڑوں کام نمٹاتی تھی پھر شام کو گھر پر بچوں کی ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ اپنے بہن بھائیوں کو وہ ماں اور باپ دونوں کا پیار اور توجہ دے رہی تھی۔ باپ نے گھر سے غائب ہو کر چٹکارا پالیا اور ماں نے فرار میں پناہ ڈھونڈ لی۔

صبح جب عالیہ آفس کے لیے روانہ ہوتی تھی تو کتنے لڑکے اسے دیکھ کر آہیں بھرتے تھے وہ ان سب سے بے نیاز تھی اور اپنی ہی دُھن میں مگن تھی کہ بہن بھائی پڑھ لکھ جائیں، ماں خوش رہے، جو عمر لڑکیوں کی سپنے دیکھنے کی ہوتی ہے۔ وہ اس نے آٹا نمک اور تیل کے چکر میں گزار دی تھی۔ اپنے لیے تو اس کی صرف ایک آرزو تھی کہ اس کا اور ریحان کا ایک چھوٹا سا گھر ہو۔ وہ بھی اس وقت جب وہ ان ساری ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاتی۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے اچھے موسموں کا انتظار کیے جا رہی تھی۔ کیونکہ ریحان بھی فوری طور پر اس کے خوابوں کی تعبیر نہیں دے سکتا تھا۔ اس پر بھی بہنوں کی شادی کی ذمہ داری تھی۔ بوڑھے ماں باپ تھے اور پھر ایک کلرک کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔ وہ دونوں ہی اچھے دنوں کے انتظار میں کٹھن موسموں کا مقابلہ کیے جا رہے تھے۔

مجھے عالیہ پر بہت رحم آتا تھا۔ کاش میں اس معصوم روح کے لیے کچھ کر سکتا، کاش میں اس کے دکھوں کا مداوا کر سکتا۔

ایک روز میں نے ریحان کو گھیر لیا۔ ''یار تم عالیہ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

''میں شادی عالیہ سے ہی کروں گا پر ابھی نہیں۔''

''پھر کب کرو گے؟ تم لوگوں کو ملتے ہوئے سات برس ہو گئے ہیں۔ عالیہ اب کے دسمبر میں پورے تیس برس کی ہو جائے گی۔ وہ بہت تھک گئی ہے۔ اسے تمھارے سہارے کی ضرورت ہے۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ وہ ٹوٹ جائے گی، بکھر جائے گی۔''

''تم میرے گھریلو حالات سے تو واقف ہو۔ میں کیا کروں؟ مسائل کا ایک انبار ہے جو دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بڑی مشکل سے تین بہنوں کے ہاتھ پیلے کر پایا ہوں۔ ابھی دو بہنوں کی شادی باقی ہے۔ مجھے خود احساس ہے کہ وہ کب سے میرا انتظار کر رہی ہے۔ پھر ابھی تو اس کے اپنے مسائل باقی ہیں۔ ابھی تو عابد صرف بی اے کر سکا ہے۔ تم جانتے ہو آج کل اتنی سی پڑھائی کی کیا ویلیو ہے۔ اور پھر میں نہیں چاہتا کہ وہ ایک جہنم سے نکل کر دوسرے میں آ جائے۔ میں اسے اپنی زندگی میں اس وقت شامل کروں گا جب میں اس کو سکھ اور خوشی دے سکوں۔'' ریحان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''کبھی سوچتا ہوں کہ اسے کہہ دوں وہ میرا انتظار نہ کرے۔ یہ تو بڑی کمینی بات ہو گی۔'' میں جواب میں خاموش رہا اور ریحان نے اپنا سر میز پر ٹیک دیا۔ جیسے اس نے تقدیر سے ہار مان لی ہو۔

''یار ہم جیسے لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اس طرح کی عبث خواہشات اور جذبے کیوں بو دیتا ہے جن کو ہم پورا نہیں کر سکتے۔'' وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

اس روز عالیہ اکیلی ہی گھومنے نکل گئی۔ کچھ دیر وہ بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑی رہی۔ اسے اپنی زندگی کے ادھورے پن پر ہنسی آ رہی تھی۔ بھاگتی کاریں، سائیکلیں، رکشے اور پیدل چلنے والے لوگ سب خوش باش دکھ رہے ہیں۔ خدا جانے انھوں نے کیا پا لیا ہے۔

عالیہ تھکی ہاری اپنے گرد شال لپیٹے خزاں رسیدہ پتے کی طرح بے مقصد چلی جا رہی تھی۔ آج اس کا دل بڑی طرح ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ریحان کو قصوروار نہیں سمجھ رہی تھی۔ اسے صرف تقدیر سے شکوہ تھا۔ گلہ تھا تو اپنے مقدر سے، وہ اور ریحان تو صرف پٹے ہوئے مہرے تھے، جن کی اپنی نہ کوئی مرضی تھی نہ خواہش وہ تقدیر کے ہاتھوں کٹھ پتلی تھے۔ جن کی ڈور کسی ان دیکھی قوت کے ہاتھوں میں تھی۔ ''اللہ میاں کیا میں اتنی ہی خوشی کی بھی حقدار نہیں ہوں۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر شکوہ کیا اور واپس گھر

کی اور چل دی۔

اس روز شام کو عالیہ نے اپنے کمرے میں ایک ٹنڈ منڈ درخت کی تصویر آویزاں کر دی، جس کے نیچے لکھا ہوا تھا ''انتظار موسم گل'' اس نے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا اور تکیہ اس کے آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔

کچھ عرصے سے عالیہ کچھ عجیب سی ہوتی جا رہی تھی۔ خاموش اور کم گو۔ وہ جیسے ہنسنا ہی بھول گئی تھی۔ میں اور ریحان اسے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ کروانے کو کہا تھا۔ کاش وہ رپورٹ کبھی نہ سنتے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ عالیہ کو خون کا سرطان ہے۔ اگر مریض کو باہر بھیج دیا جائے تو علاج ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں خاموش رہے کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم نے ڈاکٹر سے درخواست کی کہ وہ مریض کو اس کے مرض کی نوعیت سے آگاہ نہ کرے تو اس کی مہربانی ہوگی۔

میں نے عالیہ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو مجھے وہاں کہیں بھی موت کے سائے نظر نہیں آئے کیوں کہ ان آنکھوں میں خلوص کی چمک تھی، محبت کی روشنی تھی اور ایثار کا جذبہ تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اسے زندگی سے پیار تھا۔ اور ابھی اس نے زندگی میں دیکھا ہی کیا تھا۔ ہم نے اپنے دل کو تسلی دی تھی کہ عالیہ نہیں مر سکتی۔ پھر اس کی رنگت دن بہ دن سرسوں کے پھولوں جیسی ہو رہی تھی۔ رات کو ہم واک کے لیے نکلتے تو وہ جلدی تھک جاتی تھی۔ ہم نے اسے نوکری چھوڑنے کا کہا تو وہ کسی طور مان ہی نہیں رہی تھی۔

''بھئی میں کیوں اچھی بھلی لگی لگائی نوکری چھوڑ دوں۔''

''تم کچھ آرام کر لو۔ دیکھو کتنی کمزور ہو گئی ہو۔'' ریحان نے اسے سمجھایا۔

''اور پھر میں نہیں چاہتا کہ جب ہماری شادی ہو لوگ میری دلہن کو دیکھ کر باتیں بنائیں کہ اتنی سوکھی سی دلہن ہے۔''

شادی کے نام پر ایک یاس میں بجھی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی تھی۔

''اگر میں نوکری چھوڑ دوں تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔''

''تمھاری جگہ عابد کو مل جائے گی۔ میں نے باس سے بات کر لی ہے۔''

میں یہ کہانی آپ کو اس لیے نہیں سنا رہا کہ عالیہ مر کیوں گئی یا وہ کتنی باہمت اور خوب صورت لڑکی تھی۔ بل کہ اس لیے سنا رہا ہوں کہ اس کی یاد قدم قدم پر میرا دامن پکڑتی ہے۔

آخری دنوں میں وہ کتنی کمزور ہو گئی تھی۔

اگرچہ ہم نے اپنے طور پر اس کی بیماری چھپانے کی بہت کوشش کی تھی پر وہ جان چکی تھی کہ وہ آہستہ آہستہ موت کی وادی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اب کی بہار عالیہ کے چہرے پر خزاں کی پیلاہٹ تھی۔ وہ دن بھر بستر پر پڑی رہتی تھی۔ اس روز میں اور ریحان اسے ہنسانے کوشش کر رہے تھے پر وہ بہت غم زدہ تھی۔

''ریحان! تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ مجھے کیا بیماری ہے؟ ڈاکٹر صاحب بھی نہیں بتاتے۔''

''نہیں عالی تمھیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں خون کی کمی کی وجہ سے کمزور ہوگئی ہے۔ بس دوائی اور خوراک باقاعدگی لیا کرو۔ ان شاء اللہ جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔ پھر ہم مری چلیں گے۔'' ریحان نے جانے کتنے ضبط سے اسے یہ سب کچھ کہا۔ میرا دل چاہا میں دھاڑیں مار کر رو پڑوں۔

''ریحان میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔'' وہ اپنے ہاتھوں سے منہ چھپا کر رو پڑی۔ پھر دیر تک ہم سب خاموشی میں ڈوبے رہے۔

اس روز موسم بہت اچھا تھا۔ میں گیا تو عالی تکیے میں منہ چھپائے لیٹی ہوئی تھی۔

''عالی! کمرے سے باہر نکلو۔ کتنا اچھا موسم ہے۔'' میں نے اسے اٹھانا چاہا۔

لیکن وہ خاموش رہی اس میں اتنی سکت ہی کہاں رہی تھی۔

''اٹھو تو سہی یار! کیا بور لڑکی ہو۔'' میں نے اصرار کیا۔

''نہیں'' اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''زندگی کتنی مشکل ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

میرے کمرے کی کھڑکی بند کرو۔ یہ پھول آسمان پر چمکتا ہوا چاند اور تارے مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔'' اس نے آنکھیں بند کر لیں اور میں باہر نکل آیا۔

''ریحان! ناراض ہو گئے ہو۔'' میں پلٹ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''میں جانتی ہوں کہ میں کچھ دنوں کی مہمان ہوں۔ میں نہ رہوں گی تو اسی طرح چاند تارے جھلملائیں گے۔ سورج اُسی طرح چمکے گا۔ میرے گھر والے کچھ دن مجھے روئیں گے۔ پھر زندگی کی گاڑی کھینچنے میں لگ جائیں گے۔ اور ریحان وہ جب کبھی اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائے گا اور کبھی کسی لڑکی کا ہاتھ تھامے گا تو اسے شاید میں یاد آجاؤں کہ میں نے اس کا کتنا انتظار کیا تھا۔ اور میں تو ابھی بھی انتظار کرتی رہتی اگر زندگی مجھ سے وفا کرتی۔ اب میں تھک گئی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔ پاگل سمجھتا ہے کہ میں اپنی بیماری سے آگاہ نہیں ہوں۔ جس کی رگوں میں دوڑنے والا خون ہی بیمار

ہو جائے وہ کیسے اپنی بیماری سے لاعلم رہ سکتا ہے۔ میں تو اپنی زندگی کے دن انگلیوں پر گنتی رہتی ہوں اور اب تو اس اذیت بھری زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے جلد ہی جو ہونا ہے ہو جائے موت کا انتظار موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔ ''عالیہ پلیز ایسی باتیں مت کرو۔''

''جمیل تم بہت اچھے دوست اور بھائی ہو۔ میرے جانے کے بعد تم، میرے گھر والوں کو اکیلا نہیں چھوڑنا۔ وعدہ کرو۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر جیسے مجھ سے عہد لیا۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔

ڈھلتی شام میں اور ریحان آئے تو وہ قدرے بہتر لگ رہی تھی۔ اس نے گلابی سوٹ پہن رکھا تھا، جو اس کے املتاس جیسے چہرے کو ہلکی سی تازگی دے رہا تھا۔ وہ تکیوں کے سہارے پلنگ پر بیٹھی تھی۔

''ارے واہ آج تو بہت اچھی لگ رہی ہو، ریحان عالیہ سے مخاطب ہوا۔

''ہاں لگتا ہے پہلے سے بہتر ہوں۔'' میں نے ریحان کی تائید کی۔''

''ہاں! بجھتے ہوئے دیے کی آخری لو بھڑک رہی ہے۔ عالیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ایمان سے بڑی خراب ہو! مجال ہے ذرا خوش ہونے دو۔'' ریحان نے روٹھنے کی ایکٹنگ کی۔

اور پھر وہ باتیں کرتے کرتے ہی میٹھی نیند سو گئی۔ اس نے ڈاکٹر کا ابھی انتظار نہیں کیا۔ آج اسے مرے دوسرا دن ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اب چند یادیں رہ جائیں گی یا پھر وہ خواب جو ہم نے مل کر دیکھے تھے اور اس کی ہنسی کی جلترنگ ہمارے کانوں میں گونجا کرے گی۔

کل شام وہ رخصت ہو گئی۔ وہ نازک سی خوبصورت سی لڑکی، جو زندہ رہنا چاہتی تھی۔ جانے کون لوگ اپنی آرزوئیں پا لیتے ہیں۔ عالیہ کی آرزو اتنی بڑی تو نہیں تھی۔ وہ کونسا محل ماڑیاں مانگ رہی تھی۔ اس کی آرزو تو فقط ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اور ریحان کا ساتھ تھا۔

میں اس کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا ہوں۔ اور دیوار پر آویزاں تصویر کو دیکھ رہا ہوں۔ عالیہ کی شبیہہ میری آنکھوں میں دھندلائی جا رہی ہے۔ اور میری آنکھوں میں اس کی موت کا منظر اُبھر رہا ہے۔

وہ جو زندہ رہنا چاہتی تھی۔ موت کے سامنے کیسے بے بس ہو گئی۔

''انتظار موسم گل''۔ والی تصویر پر اب کبھی پھول نہیں کھلیں گے۔ میری آنکھوں میں آنسو ہیں اور ہر چیز دھندلا رہی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

چُوں

ابا جان ایک جدید، ہمہ صفت روبوٹ لے کر آئے تھے۔ روبوٹ سخت اور سفید گتے سے بنے ہوئے ایک بڑے سے ڈبے میں محفوظ تھا۔ ڈبہ کھولنے سے پہلے ابا جان نے ہم سب کو روبوٹ کی خوب صورت اور پُرکشش تصویریں دکھا کر حیران کر دیا۔ ایک تصویر دیکھ کر امی جان نے جذبات سے لرزتے ہوئے کہا میں اس کا نام عبداللہ رکھوں گی۔

پھوپھی جان جو کہ امی سے قدرے عمر میں بڑی تھیں۔ اور اپنی شادی کے انتظار میں فربہ ہوئے جا رہی تھیں کیونکہ ان کا منگیتر سالوں پہلے پیسہ کمانے ملک سے باہر گیا تھا۔ اور واپس آنے کا کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اپنے ہاتھوں میں تصویر تھامے فوراً دادا جان کے قریب جا کر بولیں۔ ابو آپ اس کے کان میں اذان تو دیں گے نا، میں اسے اچھی طرح سے دین کی تعلیم سے روشناس کراؤں گی۔ یہ بہت اچھا اور نیک بچہ بن کر ہمارے درمیان خوش رہے گا۔ دادی جان جو کہ دادا کی کھونٹی والے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔ ڈانٹتے ہوئے بولیں، چل ہٹ، میں خود اسے اپنے پاس بٹھا کر چھ کے چھ کلمے ازبر کرواؤں گی، نماز، روزے اور حج عمرے کی سعادت کے لیے بھی بہت سے لوگوں نے اپنی خدمات پیش کی۔

چچا جان جو کہ وہیل چیئر پہ بیٹھے بیٹھے سرخ پانڈے کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ان کے کنوارے پن، بے روزگاری کے کئی سال وہیل چیئر کے اندر ہی دھنس کے رہ گئے تھے وہ بڑے بڑے ہاتھوں سے وہیل چیئر کا پہیہ گھماتے ہوئے ڈبے کے قریب آ کر فخریہ انداز سے اعلان کرتے ہوئے بولے، اور اس کا ختنہ میں خود اپنے ہاتھوں سے سرانجام دوں گا، ان کے اس اعلان کے بعد چند نسوانی آوازوں کی گونج ابھری، ہائے اللہ----

ذرا خاموشی ہوئی تو گتے کے ڈبے سے اندر نیلا اور سفید دھواں باہر نکل کر پھیلنے لگا۔ ابا جان نے عجلت اور پریشانی میں گتے کے ڈبے کو کھولنے کے بجائے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ چارفٹ کے روبوٹ کو جب انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اُٹھانے کی کوشش کی تو روبوٹ کے نیلے نیلے ہونٹوں سے آواز آئی۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ میرے اندر اس قسم کی ہراسمنٹ کے خلاف کوئی دفاعی نظام موجود نہیں تھا اور پھر ایک لمبی سی باریک چوں کے بعد روبوٹ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

کلیم خارجی

پارٹنر

فرخندہ کریم پینتالیس برس کی ایک پُروقار خاتون تھیں - میں نے پہلی بار انھیں بھوربن میں دیکھا تھا۔ عام طور پر ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری رہتی لیکن جب بعد میں ملاقاتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ جاننے والوں کی محفل میں وہ خوب مسکراتی تھیں اور ہنسی مذاق بھی کرتی تھیں۔ فرخندہ کریم کا قد لمبا تھا، رنگت سفید تھی، بال سیاہ تھے، جسم قدرے فربہ تھا لیکن بُرا نہیں لگتا تھا۔ لبوں پر ہلکی سی گلابی لپ اسٹک اور بالوں میں دھیمی دھیمی خوشبو ہوتی۔ کسی مرد کو اپنے قریب دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سی جاتی تھیں اور بے وجہ دائیں بائیں دیکھنے لگتیں۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھیں اور مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ وہ ابھی تک کنواری تھیں۔

میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ میں سلمان بھائی کے گھر میں رہتا تھا۔ سلمان بھائی کو وراثت میں باپ کا کروڑوں کا بزنس اور بھوربن کا مکان ملا تھا۔ یہ مکان گرمیوں کے سیزن کے علاوہ سال کے باقی مہینوں میں بند رہتا تھا۔ گرمیوں میں سلمان بھائی اپنی فیملی کے ساتھ تین ماہ یہاں گزارتے تھے۔ انھوں نے کچھ ایسی محبت سے مجھے اپنے گھر میں چھٹیاں گزارنے کی دعوت دی کہ میں رد نہ کر سکا۔

سلمان بھائی دراصل میرے دوست تھے لیکن مجھے اپنے بڑے بھائی کی طرح ہی عزیز تھے۔ سلمان بھائی اپنے دو بچوں شانی، مانی اور بھابی سارہ کے ساتھ آئے تھے۔ فرخندہ کریم کا گھر ان کے گھر سے قریب ہی تھا۔ ایک دو بار آمنا سامنا ہوا۔ شناسائی بڑھی تو ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا۔ ایک دن سلمان بھائی نے بتایا کہ بزنس کے سلسلے میں انھیں واپس کراچی جانا پڑے گا۔ بھابی تو منھ بنا کر بیٹھ گئیں۔ میں نے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانے۔ کہا کہ جانا بہت ضروری ہے بصورت دیگر نقصان ہوگا۔ بہرحال وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد دو تین دن

وسیم جبران

بوریت کے تھے۔ پھر بھابی سارہ کی چھوٹی بہن فرحی آ گئی۔

فرحی کی عمر بیس اکیس برس تھی۔ اس کے دلکش چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ رہتی۔ بھرے بھرے ہونٹوں کے گوشے پر سیاہ تل اس کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا۔ سلمان بھائی نے ٹیبل ٹینس کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ میں چونکہ ٹیبل ٹینس کا عمدہ کھلاڑی ہوں اور فرحی کو ٹیبل ٹینس سے عشق ہے اس لیے روزانہ کی بنیاد پر میچ کھیلے جانے لگے۔ میچ کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پی جاتی اور گپ شپ ہوتی۔ اسی دوران میں نے محسوس کیا کہ فرحی مجھے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگی ہے۔ ایک شام فرخندہ ملنے کے لیے آئی۔ اسے شکوہ تھا کہ کئی دنوں سے ہمارا ان کے آنا جانا نہیں ہوا۔ باتوں باتوں میں ٹیبل ٹینس کا ذکر ہوا تو اس نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ طے ہوا کہ وہ سہ پہر کو آئے گی اور ٹیبل ٹینس سیکھے گی۔ دوسرے دن سہ پہر کو ہم تینوں ٹیبل ٹینس والے روم میں تھے۔ میں فرخندہ کو کھیل کے بنیادی اصول بتا رہا تھا۔

''دیکھو ہٹ کے بعد گیند کو سرور کے ایک طرف ٹیبل سے اچھلنا چاہیے، نیٹ کے اوپر سے مارے بغیر، اور دوسری طرف کی میز کو چھونا چاہیے۔ سروس کے وقت کھلاڑی، اس کا ریکٹ اور گیند میز کی پچھلی لائن کے پیچھے ہونا چاہیے۔ وصول کنندہ اپنی طرف سے اچھلتی ہوئی گیند کو واپس سرور کی طرف پھینکے گا اور غلطی تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ غلطی پر مخالف کو ایک پوائنٹ ملے گا۔ کم از کم دو پوائنٹ کے فرق کے ساتھ ہمیں گیارہ سکور کرنا ہے۔ اس طرح ہم ایک سیٹ جیت جائیں گے۔''

فرخندہ نے سر ہلایا اور بولی۔

''ٹھیک ہے میں سمجھ گئی ہوں۔ سروس کیسے کرنی ہے؟''

میں نے گیند کو ہتھیلی پر رکھا۔

''سروس کا آغاز کھلی ہتھیلی میں گیند سے ہونا چاہیے۔ گیند کو عمودی اور کم از کم سولہ سینٹی میٹر ہوا میں پھینکنا چاہیے۔ گیند پھینکنے کے بعد سرور کو اپنے آزاد بازو اور ہاتھ کو راستے سے ہٹانا چاہیے یہ رسیور کو گیند دکھانا ہے۔ تو کیا خیال ہے ٹرائی کرو۔''

فرخندہ میرے قریب آ گئی۔ اس نے قریباً فلیٹ سینے سے دوپٹا اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ غیر ارادی طور پر میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور صحیح پوزیشن میں کرتے ہوئے گیند اس کی ہتھیلی پر رکھا۔ پھر اس کا دوسرا ہاتھ تھاما جس سے اس نے ریکٹ پکڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد سرو کیا۔ گیند ٹیبل پر لگ کر اچھلی اور دوسری طرف گر گئی۔ فرحی جو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اس نے فوراً گیند اٹھائی اور ریکٹ سے سرو کرتے ہوئے ہماری طرف پھینکی۔

''چلیں میں کوشش کرتی ہوں۔'' فرخندہ نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے ابھی تک اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ فرخندہ نے دو تین بار الٹی سیدھی سروس کی اس کے بعد عمدگی سے سروس کرنے لگی۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ یہ کھیل اچھی طرح جانتی ہے۔ بہرحال اس دن کھیل سیکھنے میں خاصی دیر ہوگئی۔ ہم نے میچ اگلے دن تک کے لیے ملتوی کر دیا اور چائے کے لیے لاؤنج میں آ گئے۔ چند دن میں ہی فرخندہ مہارت سے کھیلنے لگی تھی۔ اب ایسا ہوتا تھا کہ پہلے میرا اور فرحی کا میچ ہوتا پھر جیتنے والا فرخندہ سے کھیلتا۔ اگر فرحی جیت جاتی تو وہ فرخندہ سے مقابلہ کرتی اور میں فرخندہ کو ٹپس دیتا۔ لیکن جب میں اور فرخندہ کھیل رہے ہوتے تو فرحی بور ہوتی رہتی۔ ہم نے سوچا کہ ایک اور کھلاڑی ہونا چاہیے تاکہ ڈبلز میچ ہو۔ ایسے میں میرا دھیان کاشر کی طرف منتقل ہوا۔ شام کو واک کے دوران میری کاشر سے دعا سلام ہوتی تھی۔ اس کی عمر بیس کے لگ بھگ تھی۔ جسم کچھ بھاری تھا اور چہرے پر ہلکی داڑھی تھی۔ وہ ایک شاندار ہوٹل کے مالک کا بیٹا تھا، ٹرانسپورٹ کا کام بھی تھا اچھا خاصا امیر آدمی تھا۔ وہ اکثر تیز تیز واک کرتا دکھائی دیتا تھا۔ غالباً وہ اپنا وزن کم کرنا چاہتا تھا۔ باتوں باتوں میں کھلا کہ وہ ٹیبل ٹینس کھیلتا رہا ہے۔ چناں چہ اسے ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔

فرحی کھیل میں میری پارٹنر تھی۔ اب بھرپور میچ ہونے لگے۔ کھیلتے کھیلتے ہم بالکل بھول جاتے کہ ٹیبل ٹینس سے باہر بھی ایک دنیا ہے۔ جہاں پھول کھلتے ہیں، بارشیں ہوتی ہیں، لوگ روزگار کے لیے باہر نکلتے ہیں، کوئی مہنگے ہوٹلوں میں کھاتا ہے کسی کو دو وقت کا کھانا نہیں ملتا، کوئی بیمار ہے اور ہسپتالوں کے چکر لگا رہا ہے، کسی کا مکان گر گیا ہے، کسی کی گاڑی چوری ہوگئی ہے۔ میں کئی بار ایسے ہی خیالوں میں گم ہوتا کہ فرحی کی آواز آتی۔

''پارٹنر! کیا سوچ رہے ہو؟ سروس کراؤ۔''

میں گھبرا کر ریکٹ اور گیند کو دیکھنے لگتا۔ فرحی جب پارٹنر کہتی تو مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی جیسے کوئی پیغام دے رہی ہو لیکن وہ پیغام میں سمجھ نہیں پاتا تھا یا پھر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ چائے کے وقت وہ مجھے چائے کا کپ پکڑاتی تو میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھو جاتیں، چائے پیتے ہوئے وہ بسکٹ اٹھا کر میری طرف بڑھاتی اور میں ایک بسکٹ اور کھا لیتا یا کھیل کے دوران وہ اپنے مخصوص لہجے میں مجھے ''پارٹنر'' کہہ دیتی۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ فرحی نے کوئی بہت اچھی شاٹ کھیلی اور پوائنٹ سکور کیا۔ پھر وہ میری طرف جھکی جھکی آنکھوں سے دیکھتی۔ وہ آنکھیں مجھے اپنی طرف بلاتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ وہ میرے بالکل پاس کھڑی ہوتی

اتنا پاس کہ میں اسے بازوؤں میں لے لوں لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ کھیلنے والے دو اور لوگ بھی وہاں ہوتے تھے۔

ایک مہکتی ہوئی شام میں ہم لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ کھیل ہو چکا تھا اور اب چائے کا وقت تھا۔ بھابی سارہ چائے دے کر اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ فرحی میرے سامنے صوفے پر بیٹھی اپنے بالوں کی آوارہ لٹوں میں بار بار ہاتھ پھیر رہی تھی جو بار بار اس کے چہرے پر پھیل کر اس کے شفاف گالوں کو چومتی تھیں۔ اس نے کپ میں چائے ڈالی اور آگے بڑھ کر میری طرف کپ بڑھایا۔ میں نے کپ میز پر رکھا۔ فرحی نے ایک چمچ چینی ڈالی اور چمچ گھما کر واپس رکھنے لگی تو وہ نیچے گر گیا۔

''اوہ سوری'' وہ چمچ اٹھانے کے لیے جھک گئی۔ مجھے اس کا سرخ ہوتا ہوا چہرہ اور کپکپاتے ہوئے ہونٹ اپنے بہت قریب نظر آئے۔ اس نے جھکے جھکے میری طرف ایک لمحے کے لیے دیکھا۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ میں اس کی گرم سانسیں اپنے گالوں پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹ ذرا سے کھل گئے تھے۔ عین اسی وقت مجھے آہٹ سنائی دی۔ شاید فرخندہ اور کاشر بھی کمرے میں آ رہے تھے۔ میں غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹا۔

فرحی نے زیر لب کچھ کہا اور ہونٹ چباتے ہوئے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ فرخندہ اور کاشر نے بھی چائے لی اور باتیں شروع ہو گئیں۔ فرحی مجھ سے بات نہیں کر رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ فرخندہ نے نوٹس کیا ہے۔ چائے کے بعد کاشر چلا گیا۔ فرخندہ جانے کے لیے اٹھی تو شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ میں اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک گیا۔ اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں سے دکھائی بھی دیتا تھا پھر بھی میں اسے گھر تک چھوڑنے کے لیے اس کے ساتھ چل پڑا۔ کچھ دور تک سڑک تھی اس کے بعد ایک پگڈنڈی اس کے گھر تک جاتی تھی۔ پتھریلے راستے پر اس کا پاؤں پھسلا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ فرخندہ رک گئی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''فرحی تمہیں کیسی لگتی ہے؟''

میں اس کا سوال سن کر حیران ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھ سے فرحی کے بارے میں پوچھے گی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

''وہ اچھی لڑکی ہے۔ زندگی سے بھرپور ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اسے چاہتے ہو۔''

وہ افق پر پہاڑوں کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سورج کے آخری کنارے کو دیکھ رہی تھی۔

''اچھا لگنا اور چاہنا دو الگ باتیں ہیں۔ تم یہ نتیجہ کیسے نکال سکتی ہو؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم نے کبھی اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھا۔ وہ تمہیں کتنی پیار بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔''

میں کچھ کہہ نہ سکا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

''شاید تمہیں پتا نہیں تم اس کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد نہیں ہو۔''

اس نے مجھے الوداع کہا اور تیز تیز چلتی ہوئی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ میں بوجھل قدموں سے واپسی کے راستے پر چل پڑا۔ فرحی مجھے باہر ہی ٹہلتی ہوئی مل گئی۔ وہ ہلکی پھلکی واک کر رہی تھی یا شاید میری منتظر تھی۔

''چھوڑ آئے؟'' اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں چھوڑ آیا۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''کتنوں کو چھوڑا ہے تم نے؟'' اس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔

''اپنی زندگی کے چوبیس برسوں میں مجھے کوئی ملا ہی نہیں، چھوڑتا کسے؟'' میں نے جواب دیا۔ وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی پھر میرا ہاتھ پکڑ کر لان میں پتھر کی بنچ کی طرف بڑھی۔

''آؤ یہاں بیٹھتے ہیں۔''

ہم بنچ پر بیٹھ گئے۔ آسمان پر ستارے نمودار ہو چکے تھے۔ دور پہاڑوں پر اب روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ لان میں ایک بلب روشن تھا اس کی مدھم روشنی میں مجھے فرحی کچھ اداس لگ رہی تھی۔

''آج تم بہت اچھا کھیلی، دونوں گیمز ہم جیت گئے۔'' میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے کہا۔

''ہاں آج میں ٹیبل ٹینس میں جیت گئی لیکن محبت کی بازی ہار چکی ہوں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے گلابی ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی۔

''یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ میرا ایک بوائے فرینڈ تھا۔ میری غلطی تھی جو میں نے اس پر بھروسا کر لیا لیکن وہ مجھ سے کھیل رہا تھا۔ اس نے مجھے دھوکا دیا اور میں تنہا رہ گئی۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ کسی سے محبت نہیں کروں گی۔''

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔

''سب ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔ زندگی میں بہت سے لوگ ملتے ہیں، کچھ اچھے ہوتے ہیں اور کچھ برے۔''

''شاید مجھے اچھے لوگوں کی پہچان نہیں ہے۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بھابی سارہ کی آواز سنائی دی۔ وہ ہمیں اندر بلا رہی تھیں۔ ہم اندر چلے آئے۔ لاؤنج میں ٹی وی آن تھا۔ شانی اور مانی کارٹون دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے دن جب ہم ٹیبل ٹینس کے میچ کے لیے اکٹھے ہوئے تو ذاتی باتوں کے بجائے

کھیل پر توجہ دی۔ اچھی شام گزری۔ میں نے محسوس کیا کہ فرحی کاشر سے کچھ زیادہ ہی باتیں کر رہی تھی۔ چائے کے بعد میں نے فرخندہ کو گھر تک چھوڑنے کی آفر کی تو اس نے انکار کر دیا۔

''کاشر نے جانا ہی ہے یہ مجھے گھر تک کمپنی دے گا۔'' فرخندہ نے کہا۔ میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔

صبح میں سیر کے لیے نکل گیا۔ سہ پہر تک فراغت ہوتی تھی تو میں کہیں نہ کہیں نکل جاتا تھا۔ مختلف جگہوں پر گھومنے کے بعد واپسی کے سفر پر جب میں گھر کی طرف رواں دواں تھا تو مجھے ایک سفید کار دکھائی دی۔ میں نے کئی بار کاشر کو اس کار میں گھومتے دیکھا تھا۔ آج اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ میں نے اس کے لمبے بالوں کی جھلک دیکھی تھی۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ فرخندہ ہے۔ اگرچہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اس کے باوجود میں یونہی اپنے گھر جانے سے پہلے اس کے گھر چلا گیا۔ وہاں فرخندہ کی ماں سے ملاقات ہوئی۔ پتہ چلا کہ فرخندہ گھر میں نہیں ہے۔ میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ شاید فرخندہ کو کوئی کام ہو اس لیے وہ کاشر کے ساتھ گئی ہو۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے مگر افسوس کہ جو خبر ملی وہ بہت بری تھی۔ میں سو رہا تھا کہ کسی کی زوردار آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ فرحی میرے سامنے تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا کہ بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ صبح کے سات بجے تھے۔ ہم تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکلے۔ بہت سے لوگ فرخندہ کے گھر کے پاس کھڑے تھے اور کھائی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو فرخندہ کی لاش نکالی جا رہی تھی۔ فرحی اس کی لاش دیکھ کر بری طرح رونے لگی۔ میری بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''کیا ہوا بھائی صاحب؟'' میں نے ایک شخص سے پوچھا۔

''صبح ہی کسی نے اس عورت کی لاش دیکھی ہے۔ پتہ نہیں اس نے خودکشی کی ہے یا کسی نے کھائی میں گرا کر مار دیا۔'' اس نے بتایا۔

پولیس بھی پہنچ گئی تھی اور لاش کو تحویل میں لے لیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ریپ ہوا تھا۔

فوراً ہمارا خیال کاشر کی طرف گیا۔ ہم نے پولیس کو بتا دیا۔ پولیس اس کے ہوٹل پہنچی تو وہ فرار ہو چکا تھا۔ میں اس قدر دلبرداشتہ تھا کہ اسی شام وہ جگہ چھوڑ کر اپنے شہر واپس آ گیا اور پھر کئی برس تک وہاں نہ گیا۔ اب پانچ برس بعد سلمان بھائی کے اصرار پر بھوربن میں آیا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا مگر دل بہت بے چین تھا دروازہ کھلا تو فرحی کا چہرہ دکھائی دیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی پھر تاریکی سی چھا گئی۔ سلمان

بھائی اور بھابی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فرحی چائے بنا کر لائی۔ چائے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ فرحی کی مسکراہٹ بناوٹی تھی۔ شام کو بھابی سارہ نے مجھے بلایا۔ ان کے چہرے پر چھائی سنجیدگی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کوئی ضروری بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ فرحی برسوں سے نہیں مسکرائی۔ اس کی عجیب حالت ہے۔ اس کے لیے کئی رشتے دیکھے مگر وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ انھوں نے درخواست کی کہ میں اسے سمجھاؤں۔ چناں چہ شام کو میں اور فرحی واک پر نکلے۔ میں یونہی ٹہلتے ٹہلتے فرخندہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے گھر کے قریب ہی ایک جگہ زمین پر ایک ابھار نظر آ رہا تھا۔ شاید کوئی قبر تھی مگر اس پر کوئی تختی نہیں لگی تھی۔

''آپ جانتے ہیں یہ کس کی قبر ہے؟'' فرحی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''نہیں''

''یہ فرخندہ کریم کی قبر ہے''

''اوہ!'' میں صرف اتنا کہہ سکا۔

''اُس کا قاتل پکڑا گیا تھا؟''

''نہیں، مجھے یقین ہے وہ کاشر تھا، مگر وہ پولیس کو ملا ہی نہیں لوگ کہتے ہیں وہ کسی اور ملک میں چلا گیا تھا۔''

''لگتا ہے کسی نے قبر کی دیکھ بھال نہیں کی۔ بارشوں کی وجہ سے قبر فلیٹ ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ اس قبر کا نشان مٹ جائے اسے پختہ کروا دینا چاہیے اور اس پر ایک تختی لگانی چاہیے کہ یہاں فرخندہ کریم دفن ہے جو آج بھی انصاف کی منتظر ہے۔'' میں نے پرخیال لہجے میں کہا۔ فرحی نے مڑ کر مجھے دیکھا، پھر چند ساعتوں کی خاموشی کے بعد بولی۔

''آپ فرخندہ سے بہت محبت کرتے تھے نا، اسی لیے اس کی موت کے بعد پلٹ کر کبھی نہیں آئے۔''

''یہ تم سے کس نے کہا؟'' میں چونک اٹھا۔

''اسی نے بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا، آپ سے دور رہوں۔''

''اور تم نے اس کی بات کو اتنا سنجیدہ لے لیا۔''

''آپ نے بھی تو آنے میں کتنی دیر کی۔'' ایسا لگتا تھا وہ رو دے گی۔ اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔

''چلو پارٹنر! گھر چلیں۔'' میں اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔

''تمھاری بھابی سے ایک بات کرنی ہے۔''

''کیا بات کرنی ہے؟''

''میں کہوں گا، بھابی! میں نے آپ کی بہن کا ہاتھ تھام لیا ہے اور اب زندگی بھر نہیں چھوڑوں گا۔'' اس بار فرحی کے لبوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ بناوٹی نہیں تھی۔

☆☆☆☆☆

"مسافت"

آسناتھ کنول

کبھی کبھی ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو بڑے دوست لگتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ وہ ساری زندگی کے لیے دوست ہوں۔ یہ خواب بھی روز میرا پیچھا کرتا ہے۔ یہ خواب میری آنکھوں میں بسا ہے۔ میں جلدی سے کالم لکھ کر فارغ ہوئی۔ کالم اخبار کے آفس بھیج کر کچھ ہی دیر میں سب کچھ بھول کر گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئی۔

ٹی وی دیکھنے کا موقع ملا تو ایک پروگرام میں ایک صاحب بڑے ہی اسمارٹ اور باوقار لگے۔ نہایت مہذب اور شاندار۔ میں اُنھیں دیکھتی ہی رہ گئی۔ ایسے خوبصورت لوگ بھی دُنیا میں ہیں جو پہلی ہی نظر میں بھا جاتے ہیں۔ کوئی دوست ہو تو ایسا ہو۔ جس کی دوستی پر فخر محسوس ہونے لگے۔ یوں خواب ایک کہانی کی صورت اختیار کر گئے۔

"لائیے یہ کوٹ مجھے دیجیے۔"

"ہاں یہ لو آج تو بہت تھک گیا ہوں۔ آج کام بھی بہت تھا۔ میں ایک دو گھنٹے کے لیے سونا چاہتا ہوں۔ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ کیونکہ رات کو میں نے کل صبح کے لیے مقدمے کی تیاری کرنی ہے۔ ٹھیک ہے۔"

"آپ کافی پی لیں اور سو جائیں۔ میں فون آف کر دوں گی۔"

"اُف کس قدر تھکا دینے والا کام ہے مقدمہ لڑنا۔ کتنی مغز ماری اور کتنی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ خیر میں یہ مقدمہ جیت کر رہوں گا۔"

کافی آ گئی تھی۔ کافی پی کر وہ پُرسکون ہو گئے۔ "آپ آرام کیجیے میں کچن میں جا رہی ہوں۔" کہتی ہوئی وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

جمیل خان آج سارا دن کی عدالتی تھکن اُتارنا چاہتے تھے۔ دو گھنٹے کا الارم لگایا اور سو گئے۔ بیگم گھریلو کام کاج میں مصروف تھیں۔ اُنھوں نے شوہر کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد جمیل خان اُٹھ گئے فریش ہوئے فائلیں سنبھالیں اور گھر ہی میں بنائے ہوئے اپنے آفس کی طرف چل دیئے۔

"ذرا بیگم کافی کا ایک کپ بھجوا دیں پلیز۔" اُنھوں نے نرمی سے کہا۔ "جی اچھا۔ اور ہاں سنیئے وہ نعمت اللہ خان کا فون آ رہا ہے مسلسل۔ میں نے نمبر لے لیا ہے۔ مناسب سمجھیں تو فون کر لیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے" وہ یہ کہہ کر بیٹھے ہی تھے کہ فون پھر آ گیا۔"

"ہاں نعمت اللہ کیا بات ہے خیریت تو ہے۔"

"ایک خاص بات کرنی تھی۔"

"ایسی بھی کیا بات تھی کہ تم نے کافی فون کیے۔"

"یار بس تم مصروف اتنے زیادہ ہو کہ بار بار کال کرنی پڑتی ہے"

"اچھا بتاؤ۔ کیا خاص بات تھی۔"

"تمھاری خیریت دریافت کرنی تھی اور ایک خاص بات تھی۔"

آج ایک مضمون اخبار میں چھپا ہے۔ تمھاری بڑی تعریفیں ہیں۔ اس میں کسی لڑکی نے لکھا

ہے۔ میں نے پڑھا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔'' نعمت کا انداز معنی خیز تھا۔

''یار نعمت پسند کی بات کیا کرتے ہو۔ بندے کی اہمیت کام سے ہے۔ میرا کام ہی میری اہمیت کا باعث ہے۔ لوگ بہت محبت کرنے لگے ہیں۔ بہت سے فون کال، ای میل لیٹرز ملتے ہیں۔ کہیں چلا بھی جاؤں تو لوگ ایسے جمع ہو کر تعریفیں کرتے ہیں جیسے میں کوئی اداکار ہوں۔ حالانکہ ہوں تو ایک وکیل بس۔ کوئی اہم مقدمہ آجائے تو لوگ پرجوش ہو جاتے ہیں۔''

''یار یہ ساری باتیں ٹھیک ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ مگر یہ ذرا نئی طرز کی تعریف ہے۔ تمہارے کام کو سراہنے والی بھی اور سراہے جانے کے قابل ہے۔''

''اچھا تو میری طرف سے اُس کا شکریہ ادا کر دو۔''

''بالکل بھی نہیں۔'' نعمت اللہ مکر گیا۔

''تم خود بات کرو گے۔ نمبر تمہیں میں دے دوں گا۔''

''اچھا یار ٹھیک ہے میں خود شکریہ ادا کروں گا۔ اب ٹھیک ہے۔ مضمون تمہیں بھجوا رہا ہوں پڑھ لینا۔ ٹھیک ہے۔''

فون رکھ کر جمیل خان اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اِس بات کو تقریباً وہ بھول چکے تھے جب ٹی سی ایس کے ذریعے ایک لفافہ اُنہیں موصول ہوا۔ اُنہوں نے لفافہ کھولا تو اِس میں اخبار کی کٹنگ تھی۔ وہی مضمون جس کا تذکرہ نعمت اللہ نے کیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر مضمون پڑھنے لگے۔ مضمون پڑھتے گئے اور تحریر کے سحر میں ڈوبتے گئے۔ عجیب تحریر تھی بہا کر لے گئی۔

''آج تک کسی نے مجھے اِس پہلو سے دیکھا ہی نہیں۔ لوگ کتنی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔'' وہ کتنی ہی دیر اِس تحریر میں کھوئے رہے۔

''واقعی شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔'' اُنھوں نے سوچا اور اُسی وقت پھر نعمت اللہ کا فون آ گیا۔

''جی حضور مضمون پڑھ لیا ہو گا اور متاثر بھی ہوئے ہوں گے۔''

''مضمون تو واقعی بہت اچھا ہے لکھنے والی نے دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ تم اِس طرح کرو مجھے اُس کا فون نمبر دے دو۔ میں اُس کا شکریہ ادا کروں گا۔''

''جمیل خان صاحب میں نے تو پہلے ہی کہا تھا اور نمبر دینے کے لیے ہی فون کیا ہے۔ لیں لکھ لیں۔''

''بہت تیز جا رہے ہو نعمت اللہ۔''

''بس یار تمہاری صحبت کا اثر ہے۔''

''اچھا۔ اچھا زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں، او کے تم اُس نامعلوم حسینہ سے گپ شپ کرو۔ میں بعد میں معلومات لوں گا۔ او کے۔ اللہ حافظ۔''

جمیل خان نے نمبر دیکھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اسٹڈی میں چلے آئے۔

''بیگم ایک کپ چائے بھجوا دیں میں ذرا مصروف ہوں۔''

''جی بہتر۔'' اُنھوں نے وہیں سے جواب دیا۔ فون کی بیل مسلسل جا رہی تھی۔ مگر کوئی اُٹھا نہیں رہا تھا۔ دوبارہ کوشش کرنے پر نمبر مل گیا۔

''ہیلو'' مؤدبانہ اور شیریں سی آواز سنائی دی۔

''آداب!''

''تسلیم۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ انداز نہایت باادب اور مؤدبانہ تھا۔

''جی میں مس مہر والنسا سے بات کر سکتا ہوں جو اخبار میں مضامین لکھتی ہیں۔''

''جی میں مہرالنسا بات کر رہی ہوں۔ آپ کون بات کر رہے ہیں۔''

''میں جمیل خان بات کر رہا ہوں۔ بیرسٹر جمیل خان۔''

''آپ نے میرے متعلق مضمون لکھا۔ میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔ آپ کی تحریر بڑی مضبوط ہے، اثر رکھتی ہے۔''

''جی شکریہ میں تو بس یونہی صفحوں پر قلم گھسیٹتی رہتی ہوں۔''

''اچھے اور بُرے کا فیصلہ ہم تو نہیں کر سکتے مگر کچھ اچھا کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہمارا حق بنتا ہے۔''

میں نے کوشش کی اور میری کوشش میں ففٹی پرسنٹ آپ کا کام ہے۔ میں نے ایسی کوئی خاص محنت نہیں کی۔'' وہ بولتی چلی گئی۔

''بہرحال آپ نے فون کیا۔ میں حیران بھی ہوں اور خوش بھی۔''

''حیران کیوں ہیں۔'' جمیل خان نے پوچھا۔

''مجھے توقع نہیں تھی کہ آپ فون کر سکتے ہیں۔ آپ جیسے مصروف لوگ صرف اپنے کام سے محبت رکھتے ہیں۔''

''بات تو آپ کی درست ہے مس مہرالنسا۔ مگر ہم ایسے خشک لوگ بھی نہیں۔ زندگی میں کوئی متاثر کرنے والا مل جائے تو اُس کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ اِس شرط پر کہ وہ بُرا نہ منا جائے۔'' مہرو کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہم تو ابھی اِس کیٹیگری میں نہیں آئے کہ متاثر کر سکیں پھر بھی آپ کی تعریف کا شکریہ -- اوکے، پھر کبھی بات ہوگی۔ اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' مہرو ریسیور تھامے کتنی ہی دیر فون کے پاس کھڑی رہی۔

''پتا نہیں میں اِس جذبے کو کیا نام دوں۔ یہ محبت ہے یا پسندیدگی یا ویسے ہی اُس سے متاثر ہوں۔ مگر کیا کروں اُس کا باوقار چہرہ ذہن کی تختی پر نقش ہو گیا ہے۔ بھلائے نہیں بھولتا۔ میں اِن حالات کو کیسے قابو کروں۔ میں اُس کے لیے جذباتی تحریریں لکھنے لگی ہوں۔ جس سے میرا کبھی کوئی واسطہ نہیں اور واسطہ ہو بھی تو کیا میں اُسے حاصل ہی نہیں کر سکتی۔ وہ ایک شادی شدہ اور بچوں کا باپ ہے۔ نہایت وفادار اور حسین بیوی کا شوہر ہے۔ اور کہاں میں سانولی شام جس کا مقدر بھی اندھیروں میں ڈوبا رہتا ہے۔ مقدر بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں پارتی ہوں، تگ و دو کرتی ہوں۔ شاید کبھی میرے راستے میں چمک اُٹھیں میں بھی خوشبو بھری آزاد ہواؤں میں سانس لے سکوں۔'' کتنی ہی دیر بے دھیانی سے وہ سوچتی رہی۔

''مجھے کیا چاہیے، میری خواہش کیا ہے، مطلب کیا ہے۔ ایک شخص جو ساری زندگی قریب رہے، وجود کا حصہ رہے یا وہ جو سانس میں خوشبو بن کر مہکتا رہے۔ پر دُور کہیں اپنی دُنیا میں مگن اور مست ہو۔ جس کے لیے کوئی طلب اور خواہش نہ ہو اُسے حاصل کر لینے کا جنون ہو نہ اُس کی طلب ستائے۔ نہ اُس کی یاد رُلائے لیکن وہ سراسر اپنا ہو۔ مگر کیسے یہ تو عجیب فلسفہ ہے۔''

''میں مہرالنسا عرف مہرو جو کسی کی ادائے دلبری پر مرمٹی ہوں۔ صرف اتنی سی خواہش

رکھتی ہوں کہ کسی کے اپنا ہونے کا یقین باقی زندگی کے لیے کافی ہے۔''

مہرالنسا اپنے روم میں آ گئی۔ آج وہ بہت تھک گئی تھی۔ دفتر میں کام ہی بہت تھا۔ اخبار کے دفتر میں ویسے بھی بڑا کام ہوتا ہے اور لکھنے پڑھنے کا کام تو ویسے بھی نری سر کھپائی ہے۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔

''اماں چائے کا ایک کپ ملے گا۔ آج تو کام بہت تھا۔ تھک گئی ہوں۔'' وہ لیٹتے ہوئے بولی۔

''اچھا بیٹی لاتی ہوں چائے۔ کام بھی تو بہت کرتی ہو۔''

''اماں کام نہ کروں تو ہم دونوں کھائیں کہاں سے۔ اب اس بزرگی میں آپ کچھ کرنے سے رہیں۔ اب مجھے ہی تو کچھ کرنا ہے نا۔''

''اچھا بیٹا مگر اب جلدی سو جانا۔ کتابیں پڑھنے میں نہ لگی رہنا۔''

''جی اماں بے فکر ہو کے سوئیں، میں بھی اب آرام کروں گی۔''

کلیات فیض کو ہاتھ میں پکڑے وہ چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ اچانک اُسے بیرسٹر جمیل کا فون یاد آیا تو اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ بکھر گئی۔

''کاش یہ شخص مجھے مل جاتا تو زندگی کے رنگ ڈھنگ اور سارے اطوار بدل جاتے پر اس کے لیے مجھے کسی بڑے گھر میں پیدا ہونا پڑتا۔ یہاں اندرون لاہور کے محلوں میں کون آ کر پوچھتا ہے کہ تم کون ہو۔

''اِن تنگ تاریک افسردہ گلیوں اور عمارتوں سے بھاگ جانے کو دل کرتا ہے۔ کیسی وحشت ہے یہاں سب کچھ آسیب زدہ سا لگتا ہے۔'' اُس نے اپنا سو سال پرانا کمرہ دیکھا تو لرز کر رہ گئی۔ حالانکہ اُس نے اُسے ہر ممکن جدید بنانے کی کوشش کی تھی۔ پردے، فرنیچر، کارپٹ، ڈیکوریشن کی چیزیں۔ مگر پھر بھی بوسیدگی ہر ایک اینٹ سے جھانکتی تھی۔

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ساڑھے دس بجے کس کا فون آ گیا۔'' اُس نے سوچتے ہوئے فون اُٹھایا۔

''ہیلو میں بات کر رہا ہوں۔''

''میں کون۔'' مہرو نے حیرت سے پوچھا۔ حالانکہ آواز سُنی سُنی سی لگ رہی تھی۔

''بیرسٹر جمیل خان۔ میں نے دوپہر کو بھی فون کیا تھا۔''

''آپ۔'' وہ پھر حیرت زدہ رہ گئی۔

''آپ اِس وقت۔''

''ہاں اِس وقت میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔''

''نہیں۔ نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ابھی میں کچھ اہم دستاویزات دیکھ رہا تھا کہ آپ کا مضمون سامنے آ گیا، دوبارہ پڑھا۔ دل چاہا کہ دوبارہ بات کروں۔''

''بہت شکریہ۔''

''کیا کر رہی تھیں۔''

''میں سارا دن کی تھکن اُتار رہی تھی اور کلیات فیض کا مطالعہ کر رہی تھی۔''

''ہوں! شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔''

''جی پڑھنے کی حد تک۔'' مہرو نے جواب دیا۔

''اور کیا کیا مشاغل ہیں۔''

''اخبار کی نوکری، لکھنا پڑھنا، گھر داری اور بس۔''

''گھر داری سے مراد شادی شدہ ہیں۔''

''جی نہیں ابھی تک تو یہ خوشگوار حادثہ نہیں ہوا میرے ساتھ۔ اماں ہیں بابا وفات پا چکے ہیں۔ بس ہم ماں بیٹی ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہیں۔''

''کیا مطلب اتنی خوب صورت زندگی ایسے ہی ضائع کیے چلی جا رہی ہیں۔''

''تنگ و تاریک گلیوں میں رہنے والوں کے مقدر بھی ان گلیوں کی مانند ہوتے ہیں۔ جہاں صرف زندگی گزرتی ہے اور کچھ نہیں۔ زندگی سے رنگ اور خوشبو کشید کرنے والے محلوں اور باغات میں رہتے ہیں۔ جہاں چاروں طرف درختوں کی قطاریں اور پھلواریاں ہوتی ہیں۔ گندی نالیاں نہیں۔'' اُس نے تلخی سے کہا۔

''لگتا ہے آپ صرف زندگی کا تاریک پہلو دیکھتی ہیں۔'' جمیل گویا ہوئے۔

''نہیں تاریک پہلو نہیں اپنے اِرد گرد بکھری کڑوی حقیقت ہے۔ ہم صرف خواب دیکھتے ہیں اِس کی تعبیر تک کبھی نہیں پہنچتے۔'' لہجے میں جیسے کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی سی اُترنے لگی۔ بھیگے ہوئے لہجے کو جمیل خان نے بھی محسوس کیا۔

''آپ اتنا خوبصورت لکھتی ہیں، کماتی ہیں تو اب کسی اچھے علاقے میں گھر کیوں نہیں لے لیتیں۔''

''اپنی حفاظت بھی تو کرنی ہے۔ یہاں تو چاروں طرف محافظ نگاہیں ہیں۔ بس ذرا سی تکلیف پر ہزاروں ہاتھ آگے بڑھتے ہیں۔ کھلے علاقے میں تو دن دیہاڑے کسی کی عزت اغوا ہو جاتی ہے۔ کوئی پوچھتا نہیں۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''میرا کہنے کا مطلب ہے ہمارے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے۔ اِس لیے کسی اور جگہ جانے کا رسک نہیں لیتے۔'' اُس نے لہجے کو بدلنے کی کوشش کی۔

''ہوں۔'' جمیل نے لمبا سانس لیا۔

''آپ شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔''

''شادی کر لوں تو اماں کو کون سنبھالے۔ اماں نے تو بہت دفعہ کہا مگر اِس عمر میں اُنہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھ سے یہ نہیں ہوتا اور پھر کسی ایسے ویسے بندے کے پلے پڑ جانے سے بہتر ہے کہ اکیلے جی لیا جائے۔''

''اُف بھئی آپ بہت تلخ باتیں کرتی ہیں۔''

''حقیقت پسند ہوں اور حقیقت نگار ہوں۔''

''جی واقعی میرے بارے میں تو پوری حقیقت بیان کر دی، آپ نے مجھے کہاں آبزرو کیا۔ ہو سکتا ہے میں ویسا نہ ہوں جیسا آپ نے لکھا۔ میں اِس سے مختلف بھی تو ہو سکتا ہوں۔''

''ہر ایک کا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے۔'' وہ گویا ہوئی۔

''میں نے جس پہلو سے آپ کی شخصیت کو دیکھا مجھے وہ اچھی لگی تو میں نے لکھ دیا۔ اِس کے علاوہ آپ کیسے ہیں، اِس سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ آپ کی اپنی شخصیت ہے، اپنی زندگی ہے، اپنی مصروفیات ہیں، فیملی ہے۔''

''مہر والنسا میرا فون کرنا آپ کو کیسا لگا۔'' وہ ہنس پڑی۔

''ظاہر ہے اچھا لگا اِسی لیے تو اتنی دیر سے باتیں کر رہی ہوں۔ بُرا لگتا تو اب تک فون بند کر چکی ہوتی۔''

''ویل میں پھر بھی کبھی بات کرنا چاہوں تو آپ بُرا تو نہیں منائیں گی۔''

''یہ اِس بات پر منحصر ہے کہ میری زندگی ڈسٹرب نہ ہو۔''

''کیوں کیا زندگی ڈسٹرب ہونے کا اندیشہ ہے۔'' جمیل خان نے پوچھا۔

''ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ بہت حقیقت پسند لڑکی ہوں، اپنے انجام سے باخبر رہنا چاہتی

ہوں۔''

''ایک بات کہوں، مس مہر والنسا۔''

''جی فرمایئے۔''

''آپ اپنی تمام تر تلخیوں اور حقیقتوں کے ساتھ مجھے اچھی لگی ہیں، پھر بات ہو گی۔ اللہ حافظ۔'' اُنھوں نے فون بند کر دیا۔

''یہ کیا کہہ دیا جمیل خان میں یہی تو سُننا چاہتی تھی۔ مدتوں سے کوئی تو مجھے میری تاریکیوں سمیت پسند کرے۔ لیکن میں کبھی کسی کو دُکھ نہیں دینا چاہتی اور جمیل خان تمھیں تو بالکل بھی نہیں۔ تمھیں شدت سے پسند کرنے کے باوجود میں تمھیں کبھی آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دوں گی۔''

نیند بھاگ چکی تھی۔ کلیات فیض ایک طرف رکھ کر وہ سوچنے لگی۔ ایک ہی شبیہہ آنکھ کے پردوں پر رقصاں تھی۔ کیا میری دعائیں قبول ہوگئی ہیں۔

وہ جمیل خان کے خیال کو جھٹکتی رہی۔ نجانے کب اُسے نیند آ گئی۔

''کیا بات ہے تم آج دیر سے اُٹھیں۔''

''بس اماں نیند ذرا دیر سے آئی۔'' وہ جلدی جلدی تیار ہوتے ہوئے بولی۔ جمیل خان کی آواز ان کے سوال سارا دن اُس کا پیچھا کرتے رہتے۔ دفتر میں بھی کھوئی کھوئی رہی۔

''میں کیوں یہ سوچ رہی ہوں۔ اپنی محرومیوں کا ازالہ میں اُس سے کیوں کرنا چاہتی ہوں۔ وہی کیوں اور کیوں نہیں۔ مگر دل ہے کہ مانتا نہیں۔ اِسے کھیلنے کو چاند چاہیے جو دسترس سے کوسوں دُور ہے۔ یہ میں کن راہوں پر سرپٹ دوڑ رہی ہوں۔ اِن میں سے کوئی راستہ بھی میرے گھر کی طرف نہیں جاتا۔''

دل کو دماغ نے دلیلوں سے قائل کرنا چاہا۔ عقل کو مشورے دیئے، آنکھوں کا دھیان بٹایا، پر بات نہیں بنی۔ چاروں طرف جمیل خان روشنی بن کر پھیلے ہوئے تھے۔ ہر دیوار پر اُن کی شبیہہ تھی۔ ہر چہرے پر اُن کا گمان گزرتا۔ وہ لاچار ہو گئی۔ خود کو سنبھالتے سنبھالتے وہ نڈھال ہو گئی۔ یوں لگا جیسے ساری زندگی گزر گئی ہو۔ وہ تو صدیوں سے اِس صحرا میں پیدل چل رہی تھی آبلہ پا۔ یہ تصویریں تو ازل سے اُس کے ساتھ متحرک تھیں۔ کیا کروں میں ان کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی۔ میں ایک مضبوط لڑکی ہوں، یہ سوچ کر وہ ریت کی طرح ڈھے جاتی۔ اپنی ہی مٹھی سے وہ ریزہ ریزہ پھسلنے لگتی۔ پھر اُن کا فون آیا تو کیا کہوں گی۔ سارے بھرم کھل جائیں گے، ٹوٹ جاؤں گی۔

''مہر وتم خود کو کیوں برباد کر رہی ہو۔ تمام کوششوں کے باوجود تم اُنھیں بھول نہیں پائیں۔ اُن کی تصویر ذہن کے پردے سے جھٹک نہیں سکیں۔ تسلیم کر لو کہ تم اُن سے محبت کرتی ہو۔''

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اِس بات کو نہیں مانتی۔'' وہ خود سے لڑتے لڑتے ہار گئی تھی۔ مگر یہ جنگ ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔

وہ پوری توجہ سے اپنا کام کرتی۔ ماں کی خدمت، گھر کے کام کاج۔ وہ کسی کام میں فرق نہیں آنے دینا چاہتی تھی مگر دل کی اتھل پتھل اپنی جگہ قائم تھی۔

''میں اُنھیں اچھی لگی ہوں۔'' اِس ایک جملے نے اُس کی ساری زندگی کی ریاضت تہہ و بالا کر دی تھی۔ خود تو وہ غالباً بھول بھی چکے تھے

کہ بڑے لوگوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ اِک شکوہ بھی تھا کہ ایک ہفتہ ہو گیا۔ اُنھوں نے پوچھا تک نہیں - ایک جملہ بول کر بھول گئے۔ تمام تر انکار کے باوجود وہ اُن کے فون کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ سارا دن جمیل خان سے نجانے وہ کتنی باتیں کرتی، ہر وہ بات جو وہ کرنا چاہتی تھی۔ جو اُس کا دل چاہتا تھا۔

بالآخر اُن کا فون آ ہی گیا اور وہ گنگ سی اُن کی آواز کے زیر و بم میں کھو گئی۔

"چلو مس مہرو اتنا کیا حال ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"ساری زندگی میں آگ لگا کر پوچھتے ہو کہ کیا حال ہے۔"

"جی ٹھیک ہوں۔ آپ کہیے کیسے ہیں۔ کام کیسا چل رہا ہے۔ فیملی کیسی ہے۔"

"سب اللہ کا شکر ہے۔ میں ایک ہفتے کے لیے دراصل انگلینڈ چلا گیا تھا۔ کل رات واپس آیا ہوں۔"

"اچھا کیسا ٹور رہا آپ کا۔"

"بہت اچھا مگر اس دفعہ ایک تبدیلی بھی میرے ساتھ تھی۔"

"وہ کیا؟" مہرو کا دل دھڑکا۔

"آپ کی آواز میرے ساتھ رہی۔" مہرو کانپ کر رہ گئی۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا" وہ چپ سی ہو گئی۔

"کہاں کھو گئیں۔"

"نہیں کچھ نہیں۔ مہرو نے خود کو سنبھالا۔

"بھئی اُس دن تو آپ بہت بول رہی تھیں۔ مجھے آپ کا بولنا اچھا لگا تھا۔ اور آج آپ نے غالباً نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بمشکل مسکرائی۔

"کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟" وہ کرید رہے تھے۔

"میرا فون کرنا بُرا لگا۔ معذرت چاہتا ہوں۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ آپ نے یقیناً مجھ ناچیز کو یاد کیا ہوگا۔ میں اپنے ہی طور پر خوش فہمی میں مبتلا ہوتا رہا۔"

"دیکھیے جمیل صاحب اب بات نہ بڑھائیں تو اچھا ہے۔ میں شاید آپ کی توجہ افورڈ نہ کر سکوں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"کیوں آخر کیوں۔" وہ لڑنے پر اُتر آئے۔

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اتنا فارغ بیٹھا ہوں کہ سب پر اپنی توجہ نچھاور کرتا پھروں۔ میں بہت ریزرو قسم کا آدمی ہوں۔ آپ کی گفتگو نے میری سوچ کو نیا رُخ دیا اور پھر میں نے کچھ طلب بھی نہیں کیا۔ کیا آپ نہایت خود غرض خاتون ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو سمجھ نہیں پایا، فون کرنے کی معذرت۔ اللہ حافظ۔" اُنھوں نے فون رکھ دیا۔ آنسو اُس کے اندر باہر کو بھگو رہے تھے۔

"میں اپنی ذات کی تلخیوں میں آپ کو شامل نہیں کر سکتی جمیل۔ آپ کو اپنے ساتھ کانٹوں میں نہیں گھسیٹ سکتی۔ ایک ہنستی بستی فیملی کو ڈسٹرب کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔" کتنی ہی دیر وہ محبت کی مرگ پر آنسو بہاتی رہی۔

اِک کسک سی دل کو کاٹتی رہی لیکن وہ مطمئن تھی۔ اُسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ اُس نے نئے سرے سے خود کو سنبھالا۔ وہ اِس حالات کو ڈھیل دیتی تو بات بڑھ جاتی اور پھر حالات بگڑ جاتے۔ اُس نے خود کو مطمئن کیا اور نئے سرے سے اپنے کام میں جت گئی۔

مگر جمیل خان اس تلخ سی لڑکی کی کڑوی باتیں بھلا نہیں سکے۔ آفس میں کتنی ہی دیر وہ خالی الذہن بیٹھے رہے۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں بیٹھے بٹھائے کدھر کو چل نکلا ہوں۔ کسی تاریک محلے میں رہنے والی مڈل کلاس لڑکی میرے حواسوں ہر قابض ہونے لگی ہے اور کیسے اُس نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔ اور میں ہوں کہ اُسے بھول ہی نہیں پا رہا۔ نہ کبھی اُسے ملا، نہ اُسے جانتا ہوں۔ نعمت اللہ نے مجھے کس طرف لگا دیا ہے۔

مہر النسا میں جانتا ہوں تم مجھ سے بچنا چاہتی ہو اور مجھے بھی بچانا چاہتی ہو۔ مگر تمہیں کیا معلوم کہ بات میرے بس سے باہر ہو گئی۔ زندگی میں پہلی دفعہ تو اِن جذبوں سے روشناس ہوا ہوں۔ ساری زندگی تو کام کرتے گزر گئی۔ روٹین لائف جذبوں سے عاری، لفظوں سے کھیلتے، حرفوں کا ہنر دکھاتے، آواز اور علمیت کا جادو جگاتے زندگی گزر گئی۔ کہاں گئی پتا ہی نہیں چلا۔ کوئی جذبہ، نہ خواہش، نہ تڑپ، نہ کسک۔ جیسی زندگی ہونی چاہیے ایک ہی ڈگر پہ چلتی زندگی۔ شادی، بیوی، بچے، گھر، نوکری۔

پر میں کہاں ہوں۔ میرا اپنا آپ کہاں ہے۔ میری ذات کہاں رہی۔ میں تو سب کا ہوں مگر میرا کیا ہے۔ کبھی کسی کو پسند نہیں کیا، کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ خود سے الگ ہو کے سوچا ہی نہیں تو پھر یہ تبدیلی کیوں۔ مہرو کی آواز امرت بن کر بن کر کیوں میرے وجود میں میں اُتر گئی۔ میرے پاس اتنا کچھ ہے۔ کیا ہے اگر میں مہرو کی زندگی کی تاریکیاں دُور کر سکتا، مگر اُس نے تمام امکانات اور ممکنات کو رد کر دیا ہے۔ کیا کروں اِس تھوڑے سے عرصے میں ہی اِس سے بات کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔

"مہرو کاش تم سمجھ سکتیں، میں تمہیں کبھی پریشان نہ کرتا۔ میں تو تمھاری مدد کرنا چاہتا تھا۔ مگر تم نے پہلے ہی قدم پر روک دیا، کاش تم مجھے سمجھ سکتیں۔" جمیل خان کتنی ہی دیر تصور میں کھوئے رہے۔ وقت کو گزرنا ہے، گزر جاتا ہے۔ مہرو کی زندگی میں اِس تبدیلی کو آئے چار ماہ ہو گئے تھے۔ اب وہ کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔

کل ہی اُسے اسلام آباد میں ایک سیمینار کا لیٹر ملا تھا عورتوں کے مسائل پر ایک بین الاقوامی مذاکرہ تھا۔ اُسے بھی پروگرام کی کوریج کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اپنے اخبار کی طرف سے اُسے وہاں جانا تھا۔ وہ جانا تو نہیں چاہتی تھی مگر جانا ضروری تھا۔ اماں کے لیے کھانا بنا کر فریج میں رکھا اور ماں کی فکر اور دعا کے سائے میں وہ سفر پر چل پڑی۔

سیمینار میں پورے پاکستان سے سرکردہ خواتین آئی تھیں۔ کئی واقف کار خواتین اور صحافی وہاں موجود تھے۔ سٹیج سیکرٹری کی جانب سے بہبود خواتین کی وزیر صاحبہ کو صدارت کے لیے بلایا گیا۔ مہمانِ خصوصی کے لیے جس کا نام پکارا گیا، وہ نام سُن کر وہ ساکت ہو گئی۔ ہیومن رائٹس کے حوالے سے بیرسٹر جمیل خان کو دعوت دی گئی تھی وہ مہمان خصوصی تھے۔ وہ ہاتھ میں کاپی پنسل اور کیمرہ پکڑے ساکت و جامد بیٹھی تھی۔

"کہیں اُنہیں پتہ نہ چل جائے۔"

"مگر میں ڈرتی کیوں ہوں۔" اُس نے خود کو حوصلہ دیا۔

''ہمارے درمیان کون سے عہد و پیمان ہوئے تھے جو ٹوٹ گئے۔ وہ ایک شاندار اور باوقار شخص ہیں۔ میں تو اُن کی دوستی کے لائق بھی نہیں۔ ایسے خواب سجانے کا فائدہ کیا جن کی کوئی تعبیر ہی نہ ہو۔'' اُس نے سر کو جھٹکا اور کام میں مصروف ہوگئی۔ ہلکے سے گلابی رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں عینک لگائے وہ اپنے لمبے سیاہ بالوں کو کلپ کیے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

''میں ان کے سامنے بھی رہوں تو وہ مجھے پہچان نہیں سکتے۔'' وہ دل کڑا کر کے تصاویر بنانے لگی۔ کیمرے کی کلک کے ساتھ ہی اُس نے سامنے دیکھا۔ جمیل خان کی نگاہیں اُس پر جمی تھیں۔ اُس کے اخبار کے نام کا ٹیگ گلے میں لٹک رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا گھبرائی۔ مگر ہمت کر کے مختلف پوز سے مطلوبہ تصاویر بنانے کے بعد وہ سامنے ہی ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر کارروائی نوٹ کرنے لگی۔ تقاریر ہوتی رہیں۔ وہ اپنے چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈ میں ریکارڈ بھی کرتی رہی، نوٹس بھی لیتی رہی۔

اس کے لمبے بال سب کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ سیمینار کے اختتام پر شاندار ڈنر تھا۔ وہ بیگ سنبھالتی ہوئی دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈائننگ ہال کی طرف چل دی۔

پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا اور سلاد ڈال کر وہ ہال کے ایک کونے میں چلی گئی۔ سب سے الگ تھلگ۔ اچانک کسی نے پیچھے سے پکارا۔

''آداب۔'' اُس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ جمیل خان اپنی تمام تر وجاہت سمیت کھڑے تھے۔ وہ چپ سی رہ گئی۔ نگاہیں اُن کے چہرے پر ٹک ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ چہرہ جسے اُس نے پوجنے کی حد تک چاہا تھا۔ اُسے دیکھنے کی تمنا کی تھی اور اب وہ اِس قدر قریب تھا کہ اُس کی سانسیں رکنے لگیں۔

''پانی، ویٹر مجھے پانی چاہیے۔''

''یس مس۔'' ویٹر نے کہا۔

''ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔''

''آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟''

''یہاں کھڑے کھڑے تو نہیں بتا سکتا۔''

''ابھی کیا مصروفیات ہیں۔''

''ہوٹل جاؤں گی جہاں میرا کمرہ بک ہے اور کل واپس لاہور۔''

''چلیں کمرے میں جانے سے پہلے میری طرف سے آپ کے اعزاز میں چائے کا ایک کپ اور کچھ نہیں سنوں گا۔ دس منٹ بعد باہر کے گیٹ پر آ جایئے گا۔'' وہ اُسے ہدایت دے کر چلے گئے۔

''کیا کروں، نہ جاؤں تو نہایت بد اخلاق کہلاؤں گی۔ پہلے ہی وہ مجھے خود غرض کہہ چکے ہیں۔ اچھا چلو دیکھا جائے گا۔ آج سُن ہی لوں۔''

''وہ ٹھیک دس منٹ بعد باہر گیٹ پر پہنچی تو سیاہ لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا اور وہ چُپ چاپ بیٹھ گئی۔ ایک دوسرے ہوٹل میں ایک کونے کی ٹیبل پر دونوں بیٹھ گئے۔ چائے آ گئی تھی۔

''تم مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ مجھ سے ڈر کر بھاگتی پھرتی ہو۔ بولو کیوں ڈرتی ہو۔''

''میں آپ سے نہیں اپنے آپ سے ڈرتی ہوں۔ اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہوں۔''

''تم نے مجھے بہت غلط سمجھا ہے۔ میں عورتوں کو ایکسپلائٹ کرنے والا مرد نہیں ہوں۔ کیونکہ تم سے پہلے میں نے کبھی کسی عورت

کے لیے مختلف احساسات محسوس نہیں کیے۔''

''دیکھیے میں ایک مڈل کلاس لڑکی آپ کی نظر عنایت کے لائق بھی نہیں۔ میں آپ کی شاندار اور چمکیلی زندگی پر ایک دھبہ نہیں بننا چاہتی۔''

''تم ایک بیوقوف لڑکی ہو۔'' وہ آپ سے تم پر اُتر آئے۔ وہ سر جھکائے چائے کے کپ سے کھیلتی رہی۔

''کیا تم مجھے ایک بے وقوف یا ایک چغد سمجھتی ہو۔''

''ہرگز نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''یا تم خود کو انسان نہیں سمجھتی ہو، مڈل کلاس ہونا تمہارا جرم تو نہیں۔ اور تمہارا اکیلا ہونا بھی گناہ نہیں۔ تمہارے ایک پرانے اور چھوٹے گھر میں رہنا بھی خرابی کی بات نہیں۔ یا تم کسی احساس کمتری میں مبتلا ہو؟''

''ہرگز نہیں۔ میں اپنے حالات میں خوش ہوں۔'' وہ بولی

''تو پھر میری پہلی فون کال پر تم نے اتنے کڑوے جواب کیوں دیئے تھے۔ اب تم خوش ہو بولو۔ تمہارے کس جواب کو صحیح سمجھوں۔''

''کسی کو بھی نہیں۔'' وہ بے رُخی سے بولی۔

مہرو اِس سارے معاملے کو یہیں ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اچانک ہی غیر متوقع طور پر جمیل خان نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ کسی مرد کا لمس، عجیب احساس اُس کے سارے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

''تم تو کانپ رہی ہو۔'' جمیل نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ یہ غیر ارادی طور پر اُنھوں نے کیا تھا۔ وہ خود بھی نہ سمجھے کہ ان سے کیا ہوا۔ لیکن کچھ ہوا ضرور تھا۔ وہ چُپ سے ہو گئے۔ کتنے ہی لمحے غیر محسوس طور پر اُن کے درمیان سے سرک گئے۔

''میں جانا چاہتی ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''اوکے، آؤ میں تمھیں ڈراپ کر دوں۔'' وہ کسی نامعلوم احساس کے سائے تلے بوجھل قدم اُٹھاتے چل پڑے۔

اِسے سمجھاتے بہلاتے میں خود بہک رہا ہوں۔ مہرو تو لمس بن کر پور پور میں اُتر گئی تھی۔

ہوٹل آ گیا تھا وہ اُتری۔

''معافی چاہتا ہوں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نہیں جانتا یہ کیسے ہوا۔ بس غیر ارادی طور پر آپ کا ہاتھ تھام لیا۔'' مہرو نے سر اُٹھایا۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں، موتی جو پلکوں پر چمک رہے تھے، اِس سے پہلے کہ سندوری گالوں پر پھسلتے جمیل کے رومال میں منتقل ہو گئے۔

''ریلیکس بے بی۔ آئی لائیک یو۔ بٹ ڈونٹ ڈسٹرب، اوکے صبح بات ہوگی، گڈ نائٹ۔''

وہ چلے گئے۔

اُس نے مُڑ کر دیکھا، جمیل خان جا چکے تھے۔ وہ خود کو سنبھالتی ہوئی ہوٹل کے کمرے میں آ گئی۔

''یا خدا کیا کروں۔ یہ تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔''

وہ اسی ادھیڑ بن میں کتنی ہی دیر خود کو کوستی رہی۔ مجھے کیا حق ہے محبت کا۔ وہ بھی ایک ایسے شخص سے جس کا اپنا ایک اسٹیٹس ہے، نام اور عزت ہے۔ میں جان بوجھ کر اپنی زندگی برباد کر رہی ہوں۔ نہیں مجھے اُنہیں سختی سے منع کرنا پڑے گا۔'' وہ ابھی تک اپنے نازک سے ہاتھ پر اِک مردانہ مضبوط ہاتھ کا لمس محسوس کر رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر آنسوؤں کو روکتی رہی۔

''میں اُنہیں کیسے روکوں۔'' وہ سوچتی رہی کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ لائن پر جمیل خان تھے۔

''سو تو نہیں رہی تھیں۔''
''نہیں نیند نہیں آئی۔''
''میں بھی نہیں سو پایا۔ زندگی میں پہلی دفعہ ان تبدیلیوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ نجانے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ دوسری طرف آپ میری وجہ سے پریشان ہیں۔ صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو پوری شدت سے چاہنے لگا ہوں۔ آئی لو یو اور یہ مقدر میں ہونا لکھا تھا۔ نہ میں قصوروار ہوں، نہ آپ ہیں۔ آپ خود کو الزام مت دیجیے۔ میں سچ میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ ویسا ہی ہوگا جیسا آپ چاہیں گی۔ یہ بات ضرور ہے کہ میں آپ کو چاہتا رہوں گا۔ ہوسکتا ہے یہ میرا وقتی جنون ہو۔ خیر ان باتوں کو ثابت کرنے کے لیے لمحہ ہی کافی ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی دلوں کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے وقت کی ضرورت ہے تاکہ میں خود کو محبت کی کسوٹی پر پرکھ سکوں۔ میں نے بات کو دلیل سے ثابت کرنا سیکھا ہے اور اس بات کو پہلے اپنے اندر ثابت کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرا کہا ہوا ناقابل تردید ہو سکے۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''
جمیل خان ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئے۔ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔
''مہرو آپ کچھ نہیں کہیں گی۔''
''میں کیا کہوں سارے فیصلے تو آپ نے خود کر لیے ہیں۔ میرے لیے تو کچھ بچا ہی نہیں۔'' اُس کی آواز میں یاسیت تھی۔
''دیکھو مہرو میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کا فیصلہ تم بہت سوچ سمجھ کر کرو تاکہ کل کو پچھتانا نہ پڑے۔ میں خود کو بھی آزماؤں گا کہ کس حد تک مخلص ہوں۔ میں تم جیسی اچھی لڑکی کو دُکھ نہیں دینا چاہتا۔ تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔ اللہ حافظ۔''
وہ کتنی ہی دیر فون پکڑ کر بیٹھی رہی۔ اِک تلخ سی مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔
''واہ بیرسٹر صاحب، محبت کا دعویٰ بھی کیا اور ہاتھ بھی چھڑا لیا۔ چلیے کوئی بات نہیں آپ کی بھی کوئی مجبوری ہوگی اور میں تو یہی چاہتی تھی۔ کسی کا گھر اُجاڑ کر اپنی خوشیوں کا محل نہیں بنا سکتی۔''
وہ سوچتے سوچتے سو گئی مگر یوں جیسے کچھ کھو گیا تھا۔ اپنا آپ گویا کسی کا ہو گیا تھا۔ خالی خالی سی وہ اُٹھی، تیار ہوئی۔ ٹیکسی لے کر بس اسٹینڈ پر آ گئی۔
وہ گھر آ گئی تھی۔ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا۔ مہرو کی آنکھوں میں اِک سنجیدگی اُتر آئی تھی۔ چہرے پر متانت ٹھہر گئی۔ قہقہوں کی جگہ اِک نامعلوم سی مسکان تھی جو بصد کوشش بکھرتی تھی۔ سب نے اِس تبدیلی کو محسوس کیا۔ سارے آفس میں اُس کے متعلق چہ مگوئیاں ہوتیں ضرور مگر سب اُس کی عزت کرتے تھے۔ یوں کوئی کھل کر پوچھتا بھی نہیں تھا۔ مہرو نے اور لگن سے کام پر توجہ دینی شروع کر دی۔ افسران خوش تھے مگر مہرو خوشی کو کہیں رکھ کر بھول گئی تھی۔ جمیل خان کا چہرہ اکثر اُسے پریشان کرتا تو وہ اور کام میں مگن ہو جاتی اور تندہی سے اپنے فرائض سرانجام دیتی۔
بوڑھی ماں سارا دن بیٹی کی فکر میں گھلتی رہتی۔ میرے بعد اِس کا کیا بنے گا۔ یہی بات دل کا روگ بن گئی تھی۔ بیٹی ماں کی خاطر شادی نہ کرتی تھی۔ اور ماں بیٹی کی ڈھلتی جوانی دیکھ دیکھ کر گھلتی جا رہی تھی۔ اپنی جگہ دونوں ہی سکھی نہ تھیں۔
اسلام آباد سے واپسی کو دو ماہ گزر گئے تھے۔

اماں نے ایک دن بات چھیڑ دی۔
"بیٹا تو شادی کر لے تا کہ میں سکون سے ابدی نیند سو سکوں۔"
"ماں میں تمہیں کس کے سہارے پر چھوڑ دوں۔ شادی کر لی تو تم اکیلی ہو جاؤ گی۔"
"تو میری فکر نہ کر۔" اماں جلدی سے بولیں "اماں تم میری فکر نہ کرو۔ قسمت میں ہو گی تو ہو جائے گی، شادی کی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔" اور اماں چپ ہو گئیں۔ اُس سے بحث کرنا فضول تھا۔
"خدا کرے اِسے کوئی ایسا شخص مل جائے جو ساری زندگی اِس کی قدر کرے، محبت کرے۔" وہ اُسے دعائیں دیتیں۔
وہ اچانک شدید بیمار ہو گئیں۔ مہرو نے چھٹی لے لی تھی۔ ہسپتال میں وہ ماں کے ساتھ تھی۔ دو دن بھی نہ گذرے کہ ماں اکیلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔ مہرو بے شک بہت بہادر لڑکی تھی۔ پر یکدم اِس حادثے نے اُسے توڑ پھوڑ دیا۔ ماں کا بوڑھا وجود کتنا بڑا سہارا تھا۔ اب یکدم وہ خالی گھر کاٹنے کو دوڑتا۔ سارا محلہ سہارا دینے آیا۔ آس پڑوس کی عورتیں سارا دن پاس رہتیں۔ پر ماں تو ماں تھی۔ اُس کے دُکھ سکھ کی ساتھی۔ آنکھوں سے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ زندگی کتنی بے وفا ہے۔ اُسے جمیل خان بہت یاد آئے۔ دو حرف تسلی کے کہہ دیتے شاید میری تنہائی کی اذیت کچھ کم ہو جاتی۔ رات کاٹنے کو دوڑتی۔ دن کا چین رُخصت ہو گیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ آفس جانے لگی۔ سب لوگ اُسے تسلی دیتے، مدد کا یقین دلاتے۔ پر وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔
ایک دن باس نے مہرو کو اپنے آفس بلایا۔
"جی سر۔" وہ اندر آئی۔
"بیٹھیے مس مہرو النسا میں آج آپ سے کچھ خاص بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"جی سر۔"
"دیکھیے آپ کی والدہ کا سہارا تو اُٹھ گیا۔ اب آپ بالکل اکیلی ہیں اور آپ جانتی ہیں کہ ہمارے معاشرے میں اکیلی جوان عورت کا زندگی گزارنا کتنا مشکل ہے۔"
"جی سر۔" وہ سر جھکائے ناخن سے میز کریدتی رہی۔ آنسو پلکوں پر جھلملا رہے تھے۔
"میں دراصل آپ کی اِس مشکل کو حل کرنا چاہتا تھا۔ آپ مجھے اپنا بزرگ ہی سمجھ لیجیے۔"
"جی سر۔" آنسو پلکوں کا بند رستہ توڑ کر بہہ نکلے۔
"میں ایک رشتے سے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔ بے شک آپ کی والدہ کی وفات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر آپ کا اکیلا پن بھی مناسب نہیں۔"
"جی سر آپ کہیے۔"
"میرے جاننے والے ہیں غوری صاحبان کا بھانجا ہے۔ بہت پڑھا لکھا اور قابل انسان ہے۔ میں اِسی اخبار میں اُسے جاب دے رہا ہوں۔ آپ اُس سے مل لیں۔ بات کر لیں۔ پسند آئے تو مجھے بتا دیں۔ باقی میرا کام ہے۔"
"جی بہتر۔" وہ فرمانبرداری سے جی کہہ کر اُٹھ گئی۔
"پریشان نہیں ہونا میں ہوں نا۔"
"یس سر۔" وہ آنسو صاف کرتی اپنے آفس میں آ گئی۔
"جمیل خان کاش تم میرا سہارا بن کر آ جاتے۔ مگر تم نے محبت کے دعوے کے باوجود پلٹ کر خبر بھی نہیں لی اور پھر تم اپنی دُنیا میں مست ہو تم میرے لیے کر بھی کیا سکتے تھے۔ میں تو ہمیشہ سے بدنصیب ہوں۔"
اگلے ہی دن وہ نعمان ظفر سے ملی تھی۔ لمبا چوڑا خوب صورت وجیہہ آدمی، بظاہر اُس میں کوئی

خرابی نہیں تھی۔ باس کو اُس نے اثبات میں جواب دے دیا۔ ایک ہی ہفتے میں وہ سادگی سے مسز نعمان ظفر بن گئی۔ نعمان کو کراچی برانچ میں ایڈیٹر انچارج بنا کر بھیج دیا گیا۔ یوں مہر النسا نئی دُنیا آباد کرنے کراچی چلی آئی۔ لاہور کی ساری یادیں وہ لاہور میں ہی دفن کر آئی تھی۔ اب وہاں رکھا ہی کیا تھا۔

چودھری حمید اللہ صاحب کا یہ احسان کیا کم تھا کہ اُنھوں نے ایک اکیلی بے سہارا لڑکی کو اپنی عافیت میں لے کر اُس کا گھر بسا دیا تھا۔ نعمان، مہر النسا کے سارے جذبات و احساسات کا خیال رکھتا تھا۔ مہر و نعمان کی خوبصورت رفاقت میں جمیل خان کو بھولنے لگی تھی۔ ماں کی جدائی کا زخم بھی بھرنے لگا۔

چھ مہینے یوں گزرے جیسے وہ ہوا پہ پاؤں رکھ کر گزری تھی۔ نعمان کی قربت اُسے بے حد راس آئی۔ صحت بھی پہلے سے اچھی ہو گئی تھی۔ وہ نعمان کا بے حد خیال رکھتی۔ لیکن اچانک بدقسمتی کہیں سے نکل کر اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ نعمان کو اچانک اخباری کام کے سلسلے میں شہر سے دُور جانا پڑا تھا۔ واپسی پر شدید قسم کے حادثے نے نعمان کے ساتھ پانچ اور لوگوں کی جان لے لی۔

اتنی بھیانک خبر اُس نے کیسے سُنی، کتنے ہی دن وہ ہسپتال میں داخل رہی۔ اِس حادثے نے اُس کا بچہ دُنیا میں آنے سے پہلے ہی اُس سے چھین لیا۔ حادثوں نے اُسے پاگل کر کے رکھ دیا۔ ساری دُنیا تاریک ہو گئی تھی۔ کہیں روشنی نظر نہیں آتی تھی۔

میں کس کے لیے زندہ ہوں۔ مر کیوں نہیں گئی۔ جدائیاں، صدمے اور حادثے میری ہی زندگی میں آنے تھے۔ ہسپتال کے کمرے میں لیٹی وہ چھت کو گھورتی رہتی۔ چودھری حمید اللہ اور غوری صاحب نے اُس کو ہر ممکن تسلی دی۔ مگر وقتی تسلیاں اُس کے اتنے گہرے زخم کیسے بھرتیں۔

ڈاکٹروں اور نرسوں نے اُسے بڑی کوشش سے اُسے زندگی گزارنے کے قابل کیا۔ خالی گھر اور دیواریں اُسے کاٹنے کو دوڑتیں۔ نعمان کی رفاقتیں اُسے رہ رہ کر یاد آتیں۔ اپنی خالی کوکھ کو دیکھ کر وہ دُکھی ہوتی۔ نعمان کی نشانی بھی زندہ نہ رہی۔ میری بدقسمتی نعمان کو کھا گئی۔ ایسے بھیانک خیال اُسے ڈراتے رہتے۔

ایک دن حمید اللہ صاحب کا فون آیا۔ اُنھوں نے عورتوں کی ایک این جی او میں اُسے کام پر لگا دیا تھا۔ عورتوں کے لیے کام کرنے والی اِس تنظیم میں عورتوں کو مختلف کام کرتے دیکھ کر وہ ذہنی طور پر مصروف ہونے لگی۔ این جی او کے آفس میں ہی اُسے ایک کمرہ رہائش کے لیے دے دیا گیا۔ کام بھی مہر النسا کی پسند کا تھا۔ اُسے عورتوں کے لیے ایک ماہنامہ ''بیداری'' کے نام سے نکالنے کی ذمہ داری دی گئی۔ وہ سارا وقت مصروف رہتی۔ یوں وقت کا پہیہ ایک دفعہ پھر چل پڑا۔ وہ اپنا کام دلجمعی سے کرتی۔ سب لوگ اُس سے خوش تھے۔ چودھری حمید اللہ صاحب نے اُس کا بڑا ساتھ دیا اور دوبارہ زندگی میں داخل کرنے میں اُن ہی کا ہاتھ تھا۔ وہ اُسے زمانے کی اُونچ نیچ سمجھاتے رہتے تھے۔

وہ اُن کی بڑی قابل ورکر رہی تھی جسے وہ بیٹیوں کی طرح چاہتے تھے۔ اِس اثنا میں وہ جمیل خان کو بالکل بھول چکی تھی۔ اب یاد کرنے کے لیے اُس کے پاس بہت کچھ تھا۔ ایسے میں کبھی کبھار اِک شناسا چہرہ اپنی جھلک

دکھلا کر غائب ہو جاتا۔ اِک کسک سی دل میں اُٹھتی۔ مگر وہ یہ سوچ کر چپ ہو جاتی۔ اچھا ہے میری بدقسمتی اِن کے راستے میں نہیں آئی۔ اپنے ہی اندر باہر یادوں کے سمندر میں ڈوبتی اُبھرتی وہ زندگی کے دن پورے کرنے لگی۔ اب زندگی میں رکھا ہی کیا تھا۔

اِس این جی او میں آئے اُسے ایک سال ہو گیا تھا۔ عورتوں کے رسالے ''بیداری'' کی سالگرہ کی تقریب تھی اور یہ تقریب ہیڈ آفس اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ اسلام آباد سے کتنی یادیں وابستہ تھیں۔ ایک چہرہ جو کبھی نہ کبھی سامنے آجاتا اور وہ اب بے دردی سے اُسے بھولنے لگی۔

این جی او کے تمام ممبرز کے ساتھ وہ اسلام آباد آگئی۔ اگلے دن شام کو چار بجے ایک بڑے ہوٹل میں تقریب تھی۔ اُسے بھی سٹیج پر آکر گفتگو کرنا تھی۔ گلابی بارڈر والی سیاہ ساڑھی پہنے میک اپ سے بے نیاز اُس نے سیاہ لمبے بالوں کی چوٹی بنا رکھی تھی۔ حسین آنکھوں میں سوگواری اور سنجیدگی رچی بسی تھی۔ چہرے پر بے حد متانت، انداز میں ٹھہراؤ، کم گوئی اور کچھ سوچتے رہنا، اُس کی زندگی کا خاصہ بن گیا تھا۔ اُس کا نام پکارا گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسٹیج کی طرف آ رہی تھی۔ اسٹیج سیکرٹری اُس کے بارے میں تعریفی کلمات کہہ رہی تھی۔ اچانک ہی وہ رُک گئی۔ بلکل سامنے جمیل خان کھڑے تھے۔ بالکل غیر یقینی صورت حال تھی۔ جمیل خان کے ساتھ اُن کی بیگم بھی تھیں جو غالباً نشست سنبھال چکی تھیں۔ چند ثانیے اِسی طرح گزر گئے۔ وہ بغیر کچھ کہے اسٹیج کی طرف چل پڑی۔

مائیک کے سامنے کھڑی ہوئی تو غیر ارادی طور پر اُس کی نظریں جمیل خان کو ڈھونڈنے لگیں۔ وہ وہیں حیران، گُنگ کھڑے تھے۔ مائیک پر اُس کی آواز اُبھرنے لگی۔ جس میں واضح ارتعاش تھا۔ وہ کچھ زیادہ نہ کہہ سکی۔ اُس کا اعتماد بکھر رہا تھا۔ زخم ہرے ہو رہے تھے۔ اِس سے پہلے کہ خود اعتمادی کا بھرم کھلتا وہ جلدی سے اسٹیج سے نیچے چلی گئی۔ این جی او کی ڈائریکٹر بیگم فرحت نواز آگے بڑھیں۔

''مہر تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ تم روم میں چلی جاؤ میں سنبھال لوں گی۔'' انھوں نے مہرالنسا کو تسلی دی۔ وہ خود کو سنبھالتی منظر سے غائب ہو گئی۔ پر جمیل خان کی نظروں سے نہیں چھپ سکی۔ بیگم جمیل دوسری خواتین سے باتوں میں مصروف تھیں۔ جمیل خان پیچھے سے اُٹھے اور بیگم فرحت نواز کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

''جمیل خان صاحب پروگرام کیسا لگا۔''

''بہت اچھا ہے۔ میں محترمہ مہرالنسا کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ وہ گفتگو کرتے کرتے اچانک چلی گئیں۔ کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔''

''بہت شکریہ بیرسٹر صاحب آپ جو ہماری قانونی مدد کرتے ہیں، وہی ہمارے لیے بہت ہے۔ ہم بڑے احسان مند ہیں۔ دراصل مہرالنسا بڑی ہی دُکھی ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ دو سال میں اُنھوں نے بہت بھیانک صدمات سہے ہیں۔ بڑی مشکل سے سنبھلی ہیں، اور اُنھیں سنبھالنے ہیں اُن کے اخبار کے مالک چودھری حمید اللہ صاحب نے بڑی مدد کی ہے۔ ورنہ یہ تو شاید مر ہی جاتیں۔'' جمیل خان حیرت زدہ سے یہ سب کچھ سُن رہے تھے۔

''ہوا کیا تھا مجھے تفصیل سے بتائیے۔'' اُنھوں نے پوچھا۔

''پہلے ان کی والدہ وفات پا گئیں۔ یہ دُنیا میں

بالکل اکیلی رہ گئیں تو چودھری حمید اللہ صاحب نے اُنھیں سمجھا بجھا کر اپنے ایک اچھے جاننے والے صاحب کے بھانجے سے ان کی شادی کرا دی۔ شادی کے بعد یہ کراچی آ گئیں۔ ان کے شریک حیات بہت عمدہ شخص تھے۔ اُنھوں نے اِن کی ساری محرومیوں کو ختم کر دیا۔ پھر اِک دن ایک اور حادثہ ہوا۔ اِن کے شوہر ایک بس حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ شوہر کے حادثہ کی خبر نے اُنھیں ایسا شاک دیا کہ اِن کا بے بی بھی نہ بچ سکا۔ ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں سے ان کی جان کو بچایا گیا۔ یہ تقریباً ایک مہینہ ہسپتال میں رہیں۔ نفسیاتی مریضہ بن گئیں تھیں۔ بہرحال ڈاکٹروں کی دن رات کی محنت اُنھیں زندگی کی طرف واپس لائی۔ ان کو سمجھانے اور سنبھالنے میں چودھری حمید اللہ صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ اُنھیں بیٹیوں کی طرح چاہتے ہیں۔ کچھ سنبھلنے پر اُنھیں پھر مصروف کرنے کے لیے ہماری این جی او کو درخواست کی کہ اُنھیں ایڈجسٹ کیا جائے۔ ہم سب نے اُنھیں زندگی سے پیار کرنا سکھایا۔ اب آہستہ آہستہ اُنھوں نے سارا کام سنبھال لیا ہے۔ ہمارے پرچے کے لیے اُنھوں نے بڑا کام کیا ہے۔ بہت دُکھی ہیں، بڑی چُپ سی ہو گئی ہیں۔ بس کام سے کام رکھتی ہیں۔ ہم اُنہیں زیادہ ڈسٹرب نہیں کرتے کہ وہ ڈپریشن کا شکار نہ ہو جائیں۔ باقی کام کے معاملے میں وہ پرفیکٹ ہیں۔''

جمیل خان گنگ بیٹھے تھے۔ ''ہنستی کھیلتی زندگی سے بھرپور لڑکی اتنے تھوڑے سے عرصے میں کہاں سے کہاں جا پہنچی اور میں نے اِس سے محبت کا دعویٰ کرنے کے باوجود اِس کی کوئی خبر ہی نہیں رکھی۔ اپنی ہی دُنیا میں مست اور مشغول رہا۔ کبھی بھول کر بھی اُسے یاد نہ کیا۔ یہ کیسی بے حسی ہے؟'' جمیل خان اتنے شرمندہ تھے کہ خود سے نظریں نہ ملا رہے تھے۔ ضمیر اُنھیں ملامت کر رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دینا مہرو میں تمھارا گنہگار ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے راستے کا ایک ایک کانٹا چُن لوں گا۔'' وہ کتنی ہی دیر خود سے وعدے کرتے رہے۔ پروگرام ختم ہو گیا تھا۔ لوگ واپس جا رہے تھے آنکھوں میں تاسف لیے وہ بھی واپس چل پڑے۔ سارے راستے وہ خاموش رہے۔ عجیب سی اُداسی نے اُنہیں گھیر رکھا تھا۔

''کیا بات ہے خان صاحب، آپ پروگرام کے بعد سے بڑے چُپ اور اُداس ہیں، کوئی خاص بات۔'' گھر آ کر بیگم نے پوچھا۔

''ہوں خاص۔ خاص تو ہے تم سنو گی۔''

''خاص ہے تو پھر ضرور سنوں گی۔''

اور یوں جمیل خان نے مہرو کے ٹیلی فون سے لے کر اب تک کی ساری کہانی بیگم کو سُنا دی۔ وہ بالکل سُن بیٹھی اِس حقیقی کہانی کو سُنتی رہی تھی۔

''اب تم بتاؤ کہ میں اِس دُکھی لڑکی کے لیے کیا کروں؟''

''آپ اب بھی اُسے چاہتے ہیں۔'' بیگم جمیل نے پوچھا۔

''اِسے محبت یا چاہنا نہیں کہتے کیونکہ اگر مجھے اُس سے محبت ہوتی تو میں اُس کی خبر رکھتا۔ لیکن اب اُس کی داستان سُن کر واقعی دُکھی ہوا ہوں۔ اور میں اُس کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''مثلاً کیا۔؟ بیگم نے پوچھا۔

''تم بتاؤ میں کیا کروں۔ وہ اتنی دُکھی ہے کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اُس کے لیے کیا کروں۔''

''آپ اُس سے شادی کر لیں۔'' بیگم جمیل نے اچانک ٹھہرے پانی میں پتھر پھینک دیا۔ اِک ہلچل سی برپا ہوئی۔ یہ تم نے کیا کہہ رہی ہو زارا بیگم! جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو۔''

''اچھی طرح جانتی ہوں اور اِس سے بہتر مدد اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ اُسے آپ جیسے کسی شخص کے سہارے کی ضرورت ہے۔''

''تم نے بڑی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ اِس کے اثرات کے بارے میں سوچو۔ بچے جوان ہیں۔ رشتہ داریاں ہیں۔ تمہارا مستقبل ہے۔ مسائل بڑھ جائیں گے۔''

دیکھیے جمیل اگر آپ صدق دل سے اُس کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی دوسری شادی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں سمجھا لوں گی سب کو۔ صرف اتنا کیجئے گا کہ ہمارا حق ہمیں ملتا رہے۔ باقی اللہ آپ کو اِس نیکی کی جزا دے۔ آپ سوچیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''چلو مان لیا کہ ہم اُسے اپنا فیملی ممبر بناتے ہیں، پر اگر وہ راضی نہ ہوئی تو۔''

''یہ کام میں کر لوں گی اِس لیے کہ میں آپ کو دُکھی، اُداس اور پریشان نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ چلی گئیں۔

''یہ عورت بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ کبھی سمجھ میں نہ آنے والی، ایک اِس لیے آگے نہ بڑھی کہ میری زندگی ڈسٹرب ہو گی اور دوسری اُسے میری زندگی میں لانا چاہتی ہے تاکہ میں پریشان نہ رہوں۔ اے عورت تیرے ہزار روپ اور ہر روپ انوکھا۔ مہرو مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ اب مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور تم میری زندگی کا حصہ ہو۔''

یہ مہم سات دن جاری رہی۔ بیگم فرحت نواز پیش پیش تھیں۔ بیگم جمیل خود مہرالنساء سے ملیں۔ مہرو نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ میں اپنی بدنصیبی کے سائے کسی ہنستے بستے گھر پر نہیں ڈال سکتی۔

''مہرو تم غلط مت سمجھو۔ میں خود تمہیں دُلہن بناؤں گی۔ جمیل خان تمہیں تمام حقوق دیں گے۔ میں اِس کا وعدہ کرتی ہوں۔''

مہرو منکر تھی مگر جمیل خان خود اُس سے ملے۔ وہ تھوڑا سا گھبرائی تو تھی پھر سنبھل گئی۔

''مہرو مجھ پر شک مت کرو۔ میں تمہارے سارے دُکھ لے لینا چاہتا ہوں۔ مجھ پر اعتبار کرو۔'' مہرو نے آنکھیں اُٹھا کر جمیل خان کو دیکھا۔ وہ اپنی شربتی آنکھوں میں اُمید کے سارے دیے روشن کیے بیٹھے تھے۔

''آپ کو دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں جمیل خان۔''

''تم ہو، نا! بس مجھے میری مہرو چاہیے۔ زندگی سے بھرپور ہنستی کھیلتی مہرو۔'' اُنھوں نے اُس کے کانپتے کمزور ہاتھ پکڑ لیے۔

''مہرو میری طرف دیکھو۔'' اُس نے بمشکل پلکیں اُٹھائیں۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔

''لو، اب یہ آنسو کبھی نہیں بہیں گے تم ضرورت سے زیادہ آنسو بہا چکی ہو۔'' سارے آنسو جمیل کے رومال میں منتقل ہو گئے۔ مہرو کو یقین آ گیا تھا۔ وہ قدرت کے اِن فیصلوں پر حیران تھی۔ آگ کی بھٹی میں سے گزار کر وہ اُسے گلزار میں لے آیا تھا۔ مہرو نے آنکھیں بند کیں اور اپنا سر جمیل خان کر بازو پر رکھ دیا۔ صدیوں کی مسافت کے بعد اُسے آسودگی نصیب ہوئی تھی۔

☆☆☆☆☆

بے حسی

جمال اس گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، جہاں بھوک، تنگ دستی، فاقہ کشی اور مفلسی جیسی ظالم و جابر مکاؤں کا کھلم کھلا راج چلتا تھا۔ جمال ماں، باپ کی تعلیم و تربیت اور رزقِ حلال کے زیرِ اثر ہونے کی بدولت ہر ناجائز اور بُرے کام سے کوسوں دور رہنے کا عادی تھا۔ اس پر مستزاد سر سے باپ کا سایہ بھی اُٹھ گیا تھا۔ وراثت میں کرائے کا گھر، بیمار کھانستی ماں اور تین جوان بہنیں ملیں۔ جمال گھر کا وہ چراغ بن چکا تھا جو خود کے لیے جلنے کی سکت بمشکل رکھتا تھا، اب اسے اپنے ساتھ ساتھ ماں، بہنوں کے لیے بھی جلنا تھا۔

ہر روز بوڑھی ماں اور غربت سے نبرد آزما بہنوں کی دعاؤں کے حصار میں تلاشِ معاش کے لیے نکلتا، پھر دفتروں کی خاک چھانتے چھانتے صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام اور بعض اوقات رات سر پر آ پہنچتی مگر نوکری تھی کہ ملتی ہی نہیں تھی۔ اگر کہیں سنوائی بھی ہوتی تو روپے طلب کر کے اسے آٹے دال کا بھاؤ بتا دیا جاتا۔ کئی بار جب وہ رات کو گھر لوٹتا تو بھوکی ماں اور بہنوں کو اپنی راہ تکتے پاتا۔ ماں، بہنیں بھی اسے خالی ہاتھ دیکھ کر زباں پر حرفِ سوال نہ لاتیں۔ خاموشی سے بستر میں چھپ کر آنسوؤں سے بستر تر کرنے میں مصروف ہو جاتیں۔ کیوں کہ بستر ان پر مہربان تھا جو انھیں اپنی آغوش میں جگہ دے کر دکھوں کا ساتھی بن کر انھیں دنیائے الم سے نجات دے کر سلا دیتا تھا۔

گزشتہ رات بھی جمال خالی ہاتھ لوٹا تھا۔ یہ رات بھی فاقہ کی نظر ہی تھی۔ صبح جب جمال پھر نوکری کی تلاش میں روانہ ہونے لگا تو منجھلی بہن اس کے پاس چلی آئی۔

''بھائی! آج اماں کی دوائی ختم ہو گئی ہے۔ کل مالک مکان بھی کرائے کا تقاضا کر کے گیا ہے۔ اس نے خوب چیخ و پکار مچائی تھی اور آج تو کھانے کے لیے بالکل بھی کچھ نہیں ہے۔'' منجھلی بہن نے قدرے دل گرفتگی سے کہا۔ وہ اپنے بھائی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ان کا سہارا بھی تو وہی تھا۔ اس سے نہ کہتی تو پھر کس سے کہتی۔ بہن کی بے بسی اور رنجیدہ نگاہیں اس کا کلیجہ چیر گئیں۔ بے اختیار اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ اور وہ اپنی بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ گھر سے نکلتے ہی آنکھوں سے سیلِ رواں جاری ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اب کیا کرے؟ پھر جی کڑا کر کے وہ اپنے دوست کے میڈیکل سٹور پر جا پہنچا۔

''آؤ! آؤ! خیریت ہے۔ آج صبح صبح ادھر کا راستہ کیسے

بابر امین ابر

بھول گئے؟'' اس کے دوست ناصر نے پوچھا۔

''یار! وہ..... وہ.....'' جمال کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔

''مجھے سب پتا ہے۔ تم ماں جی کی دوائیوں کے سلسلے میں آئے ہو اور کل مکان مالک بھی گھر آیا تھا۔ میں نے تمھیں کئی بار کہا ہے کہ دوائیوں کے سلسلے میں تم پریشان مت ہوا کرو۔ تم ماں جی کی دوائیاں لے جایا کرو۔ جب تمھیں نوکری مل جائے گی تو میں تم سے تمام حساب چکتا کر لوں گا۔ رہا کرایہ تو اس بار میں دے دیتا ہوں۔ اگلے ماہ تم بندوبست کر لینا۔ دوائیاں گھر پہنچ جائیں گی۔ اپنا منہ درست کرو اور نوکری کی تلاش میں جاؤ'' ناصر نے جمال کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو جمال بے اختیار ناصر کے گلے لگ گیا اور اس کی آنکھیں نم ہوتی چلی گئیں۔

''اچھا! اب پریشان مت ہو اور جاؤ!'' ناصر نے اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

.....

اب جمال میڈیکل سٹور سے نکل کر ایک سڑک پر جا رہا تھا۔ یہ سڑک لاری اڈے کی جانب جاتی تھی۔ سڑک ٹریفک کے رش کے باعث خاصی مصروف رہتی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے رُک گیا تاکہ ٹریفک رش کم ہوتے ہی وہ سڑک پار کر سکے۔ اس کا ذہن اپنے حالات پر مسلسل قلابازیاں کھا رہا تھا۔ پھر جب ٹریفک کے بہاؤ میں ذرا کمی آئی تو وہ سڑک پار کرنے لگا۔ اسی اثنا میں ایک گاڑی آندھی، طوفان کی مانند آئی اور جمال کو رگیدتی ہوئی یہ جا وہ اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جمال منہ، سر سرخ لیے درد سے بے حال سڑک پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ اس کے گرد بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ بھانت بھانت کی بولیاں گونج رہی تھیں۔

''ہاہ ہائے! اندھا! ناس ہو اس کا! ظالم کہیں کا! بچے کو زخمی کر گیا۔ نجانے کون سی آگ بجھانے رہا تھا؟'' ایک آواز۔

''ہاں بھئی! واقعی آج کل کے نوجوان بالکل بھی پیدل چلتے راہ گیروں کی پرواہ نہیں کرتے۔ دیکھو! بے چارہ کیسے تڑپ رہا ہے؟'' دوسری آواز۔

''دیکھو تو! بے چارے کے گرد کیسے خون کا تالاب بنتا جا رہا ہے؟'' تیسری آواز۔

''ارے! باتیں چھوڑو! اسے اٹھاؤ! ہسپتال لے چلتے ہیں۔'' چوتھی آواز۔ شاید یہ کوئی رحم دل رہا تھا۔

''اے ہٹ! بیوقوف! یہ پولیس کیس ہے۔ اس حادثے کے سلسلے میں وہ تمھیں دھر لیں گے۔ پولیس کا تمھیں پتا تو ہے ہی۔'' پانچویں آواز۔ سرزنش سے بھرپور۔

''ارے! کوئی ریسکیو والوں کو ہی کال کر دو!'' چھٹی آواز۔

آوازیں گونج رہی تھیں۔ جمال سڑک پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

اتنے میں ایک موٹر سائیکل سوار آیا۔ اس نے موٹر سائیکل سے اتر کر موبائل پر ویڈیو بنائی اور اپنے سوشل میڈیا ہینڈلز پر اپلوڈ کرنا شروع کر دی۔

☆☆☆☆☆

کمفرٹ زون

وقت کی گردش میں وہ ایک لمحہ مجھے ساکت کر گیا تھا۔ ان ساٹھ سیکنڈوں نے مجھے چند ماہ پہلے کے اس منظر کو سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ ان چند ماہ میں اس کی شخصیت مزید پُر وقار ہو چکی تھی۔ میں نے لائبریری میں قدم رکھتے ہی اس کی جانب قدم بڑھانے چاہے جبھی وہ شیلف سے کتاب نکالتے ہوئے پلٹی اور وہاں موجود ٹیبل پہ سے اپنا بیگ اور موبائل اٹھا کے باہر کی جانب بڑھنے ہی لگی تھی کہ اس نے ایک طرف میری نظر دیکھا شناسائی کی ہلکی سی رمق بھی اس کی سیاہ آنکھوں میں موجود نہیں تھی۔ وہ باوقار انداز میں ایک شان سے چلتے اپنی راہ پہ چل دی اور میں ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس سے شناسائی اسی لائبریری سے ملحقہ کیفے میں ہوئی تھی۔ میں ان دنوں ماسٹرز کے پیپرز دینے کے بعد فارغ اوقات میں مختلف جگہوں پر، خوب صورت اور دلکش مناظر کو کیمرے کی آنکھ سے قید کرتا۔ فوٹوگرافی کے شوق نے تجسس اور خوبصورتی کو دیکھنے کا ایک نیا رخ دیا تھا۔ میں یہاں لائبریری کی عمارت کی فوٹوگرافی کر رہا تھا۔ لائبریری کے ماحول میں باہر کی نسبت سکون محسوس ہوا تھا۔ وہاں کے پُرسکون منظر کو کیمرے میں محفوظ کرتے ہوئے میں کیفے کی طرف آیا۔ کیفے کا ماحول بھی گہری خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔ ایک خاموش طلسم سا تھا جو چہار سو چھایا ہوا تھا۔ میں وہیں موجود ایک کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اردگرد دیوار پہ لگی خوب صورت سی پینٹنگ پہ نظر گئی تو اس منظر کو قید کیے بنا نہ رہ سکا۔ میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ میری تصاویر میں کسی شخص کا عکس اس کی اجازت کے بنا نہ آئے۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' میں اس ٹیبل کے برابر والی ٹیبل پہ ہی موجود تھا جب اس لڑکی کو خود سے ہی باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔

''نہیں یہ دلاور علی خود کو سمجھتا کیا ہے؟ آخر کوئی کسی کے ساتھ اتنا برا کر کے کیسے مطمئن انداز میں معافی کا طلب گار ہو سکتا ہے؟''

وہ کتاب بند کر کے میز پہ پٹختے سوال کرنے والی شخصیت سے جواب طلب کر رہی تھی جس کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ یہ دلاور علی

طوبیٰ صدیقی

کون ہے۔

''یہ دلاور علی ہے کون؟'' اس کے سامنے والی چیئر خالی دیکھ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا جہاں کیفے تقریباً خالی تھا۔

''وہ، یہ اس ناول کا ہیرو اور کون''، کتاب اٹھا کے لہراتے ہوئے اس نے خفگی سے کہا۔

''حیرت ہے ایک ناول کے کردار سے اتنی جذباتی وابستگی؟'' میں نے تعجب سے کہا۔

''مجھے تو حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو ساری زندگی دوسروں کا جینا اجیرن کیے رکھتے ہیں، ان کے اردگرد ہر شخص ان کے وجود سے پریشان ہوتا ہے، کبھی کبھی تو ظلم و جبر میں انسانیت کی حد سے بھی گزر جاتے ہیں لیکن جیسے ہی کہانی اختتام کے مراحل میں داخل ہوتی ہے اچانک ہی سب کچھ صحیح ہونے لگتا ہے اور تو اور معجزاتی طور پر انہیں اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہو جاتا ہے اور معافی تلافی کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کیا فائدہ بھلا ایسی معافی کا کیا آج کی معافی گزرا ہوا کل بدل سکتی ہے؟'' میں خاموشی سے اب اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''نہیں گزرے ہوئے وقت کا نعم البدل تو کچھ بھی نہیں لیکن یہ معافی شاید آنے والا کل بہتر بنا سکتی ہے''، میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ چند منٹ غور کرنے کے بعد پھر سے گویا ہوئی۔

''لیکن یہ ضروری ہے کہ اختتام پہ سب کو معاف کیا جائے، کبھی کبھی تو مجھے شدید غصہ آتا ہے ایسے لوگوں پہ''، اس کا غصہ کسی صورت کم نہیں ہوا تھا اور میں دھیمی مسکان لبوں پر سجائے بس اسے ماتھوں پر شکنوں کا جال لیے ان افسانوی کرداروں پر برہم ہوتے دیکھ رہا تھا۔

''ہم بھی تو کہیں نہ کہیں دل میں یہی آس رکھتے ہیں۔ دیکھیں ہم ساری زندگی غفلت میں گزار دیتے ہیں اور وقت آخر رب سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں معاف کر دے ہماری توبہ قبول کر لے۔ یہی تو ہم سب کی بھی خواہش ہوتی ہے نا''، میں نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کو سوچ کو نیا رخ دیا لیکن شاید اس وقت وہ میری بات کو مکمل طور پر سمجھنے کی کیفیت میں نہیں تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے۔

''ویسے آپ کون ہیں اور یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟'' کافی دیر اس کی بات پہ سوچنے کے بعد بھی اعتراض کا پہلو نظر نہیں آیا تو اس شخص کی موجودگی پہ سوال اٹھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''واقعی؟'' اس کے عجیب وغریب سوال پہ میں نے بھنویں اچکائیں۔

''ہاں تو جان نہ پہچان اور مجھ سے ایسے باتیں ملا رہے جیسے بچپن کے دوست ہیں۔ آپ کو پہلے تو کبھی نہیں دیکھا یہاں''، وہ اب اپنے ناول اور ناول کے کردار کا غم بھلائے مجھ اجنبی کو دیکھنے لگی جو دلچسپی سے اس کی بے تکی باتیں سن رہا تھا۔

''جی میں آج پہلی بار ہی آیا لائبریری سے کچھ بکس ایشو کروانی تھیں یہاں خالی کیفے دیکھا تو آ گیا اور کچھ دیر بعد ہی آپ کو کرداروں کی شان میں قصیدے پڑھتے ہوئے سنا تو بس خود بخود آپ کی خود کلامی میں مخل ہو گیا''، میں نے اصل وجہ بتائے بغیر کہا کہیں وہ برا نہ مان جائے۔

''اوہ سوری میں شاید زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھی۔ میرا ماننا ہے کہ ہر کہانی کا ایک وہ رخ ہوتا ہے کو مصنف لکھتا ہے اور وہ جو قاری سمجھتا ہے۔ میں اکثر اپنے رخ کی کہانی خود سناتی ہوں کبھی لکھ کر تو کبھی یوں خود سے ہی باتیں کر کے...''، اس نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''اف پتا نہیں کیا کیا سن چکا ہے یہ''، اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے گردن جھکاتے ہوئے زیر لب کہا۔

''زیادہ کچھ نہیں بس دلاور علی کی شان میں جو آپ کہہ رہی تھیں بس وہی سنا''، اس کی بڑبڑاہٹ کا جواب دیتے ہوئے میں نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

''اف، میں چلتی ہوں''، اپنی کتاب سائیڈ پہ رکھے بیگ میں رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے رکیں تو میں مذاق کر رہا تھا بخدا آپ کو شرمندہ کرنا مقصد نہیں تھا۔ خیر آپ مجھے یہ کتاب پڑھنے کے لیے دے سکتی ہیں''، اس کو شرمندگی سے نکالنے کے لیے میں نے موضوع بدلا۔

''جی ضرور''، کتاب میرے حوالے کرتے ہوئے وہ خاموشی سے باہر کی جانب بڑھی۔

''یہ وقت بھی آنا تھا''، میں نے جو کورس کے علاوہ مجال ہے کسی کتاب کو آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا ہو بڑے شوق سے اس سے وہ کتاب لی اور اب اس کتاب کے سرورق کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ یہ ناولز کی ضخیم کتابیں پڑھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

''چلو پڑھ کر دیکھتے ہیں یہ محترم دلاور علی ہیں کون''، میں نے فراغت کا لطف لیتے ہوئے وہ کتاب پڑھنے کا ارادہ کیا۔

چند دن کتاب پڑھنے کے بعد میں اس کی امانت اس کے حوالے کرنے کے لیے پھر سے کیفے میں موجود تھا۔

آج وہ اس دن کے مقابلے میں مختلف نظر آرہی تھی۔ اسی کتاب پڑھتے دیکھ کر میں ٹھٹھک کر رک گیا، حیرانی بجا تھی کہ اس جیسی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے جنھیں وہ بار بار صاف کرنے کی غرض سے چشمہ ہٹاتی اور پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو جاتی لیکن اس ساری کارروائی میں اس کی آنسو رکنے کے بجائے تیزی سے رخسار پر لکیر کی صورت بہتے ایک پُرکشش منظر پیش کر رہے تھے۔ میری جانب سے وہ بے خبر اپنے آنسوؤں میں الجھی کتاب میز پر رکھ کر خود ہاتھوں میں سر ٹکائے رونے لگی۔ اس کو روتا دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔

''آج کس کردار نے آپ کو رلایا ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کھڑے کھڑے ہی اس سے استفسار کیا۔

''وہ بس ایسے ہی پلیز بیٹھیں''، اسے کھڑے دیکھ کر آج اس نے خود ہی بیٹھنے کی پیشکش کی تو میں اس کی امانت اس کے حوالے کرتے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھا۔

''اس دن آپ غصہ کر رہی تھیں آج آپ رو رہی ہیں؟ کیا واقعی ان بے جان کرداروں میں اتنی قوت ہے کہ وہ ایک جیتے جاگتے انسان کے جذبات کو کنٹرول کر سکیں؟'' میرے تفصیلی سوال پہ لمحے بھر کے لیے اس کے لب مسکرائے تھے۔ بھیگی آنکھیں اور مسکراتے لب ایک پل کے لیے دل نے خواہش کی آج اپنے اصولوں کے برخلاف جا کر اس منظر کو اپنے کیمرے میں محفوظ کر لوں۔

''بے جان؟ ہرگز نہیں یہ کردار تو بالکل ہمارے جیسے ہیں، ہنستے ہیں روتے ہیں۔ ان کا غم محسوس کر کے آنکھیں نم ہو جانا تو معمول کی بات ہے اور اس سے بڑھ کر یہ تو مصنف کی کامیابی ہے کہ اس کے لکھے کردار یوں کسی کے دل میں جگہ بنا لیں''، اس نے میری بات کا جواب دیا تو میں نے سمجھ کے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ نے پڑھی یہ کتاب؟ کیسی لگی آپ کو؟'' مجھے خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی پوچھا۔

''ہاں اچھی ہے لیکن مجھے آپ کی طرح نہ غصہ آیا اور نہ رونا''، میں نے شرارت سے کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو خود بھی مسکرا رہی تھی۔

''آپ نے دل سے نہیں پڑھی ہوگی بوجھ سمجھ کے یا پھر بس پڑھ لی''، اس نے جیسے کچھ سخت کہنے سے خود کو روکا۔

''ہاں ایسا ہی ہو شاید آپ بتائیں مجھے کیسے پڑھنی چاہیے کتاب؟ شاید ٹشو کا ڈبہ ساتھ رکھ کے آپ کی طرح''، میں نے خفیف سا طنز کیا تو وہ بھی مسکرا دی۔ آنکھوں پر لگا چشمہ

ٹھیک کرتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

''پھر کبھی ابھی میرے جانے کا وقت ہوگیا ہے''، اس رخصت ہوتے ہوئے اپنی امانت اٹھائی اور باہر کی جانب بڑھی۔ میں کئی دیر اس جگہ بیٹھا رہا۔ آج میرے ساتھ میرا کیمرا نہیں تھا، بلکہ اس لڑکی کے خیالات کا ایک عکس تھا جس نے مجھے سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

لائبریری کے احاطے میں ہی پرسکون فضا نے آج مجھے پھر سے خوش آمدید کہا تھا۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اردگرد دیکھتا ہوا کیفے کی جانب بڑھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کسی کتاب میں غرق تھی، مگر اس بار اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا، تو وہ دلاور علی جیسے کردار پر غصہ کرتی، شاید پھر کسی کہانی میں کھو چکی تھی۔ اس کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرایا۔

''پھر سے کوئی ناول پڑھ کر خفا ہو رہی ہیں؟'' اس نے چونک کر سر اٹھایا، جیسے کسی ناپسندیدہ مداخلت پر جھنجھلا رہی ہو۔

''آپ؟ پھر سے؟'' اس نے ناگواری سے کہا شاید موڈ زیادہ ہی خراب تھا۔

''ہاں، میں اور میرا خیال ہے کہ آپ اب بھی کہانیوں کے کرداروں کو بہت زیادہ سنجیدہ لے رہی ہیں''، میں نے کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو سمجھ نہیں آتی، یہ سب کچھ حقیقت سے کتنا جڑا ہوتا ہے؟ یہی کردار تو ہمارے اردگرد ہوتے ہیں۔ اور جب وہ غلطیاں کر کے معافی کے طلب گار بنتے ہیں مجھے عجیب لگتے ہیں - یہ سب معافی، تلافی، ہمدردی کا کھیل مجھے سمجھ نہیں آتا''، اس نے تلخی سے کہا۔

''زندگی میں صرف کردار نہیں، لوگ بھی غلطیاں کرتے ہیں۔ ہر چیز پر غصہ کرنے، ہر موڑ پر جذباتی ہونے سے کچھ نہیں بدلے گا۔ اصل دنیا میں اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ مسائل ہوتے ہیں، اور اگر ہم ہر بات کو اسی طرح دل پر لیتے رہے تو بس دُکھ ہی ہمارا مقدر بن جائے گا اور ہم یونہی جذباتی ہو کر ہر انسان پہ غصہ ہی کرتے رہیں گے''، میں نے نرمی سے کہا تو اس کے ماتھے پہ بل پڑے جو اس بات کے گواہ تھے کہ میری بات اسے شدید ناگوار گزری ہے۔

''زندگی میں بہت کچھ ہماری امید اور توقع کے برعکس ہوتا ہے''، یہ کہہ کر میں اٹھا اور بنا کچھ اور کہے وہاں سے چلا گیا، اسے پہلی بار خاموش چھوڑ کر۔ اس ناسمجھ اور جذباتی لڑکی سے میری آخری ملاقات ناخوش گوار ثابت ہوئی تھی۔

میں اپنی زندگی میں مصروف تقریباً اسے

بھول ہی چکا تھا۔ آج کافی عرصے بعد وہ لائبریری کی سیڑھیوں پہ بیٹھی کسی لڑکی سے بات کر رہی تھی جب شناسا آواز نے مجھے رکنے پہ مجبور کیا۔ وہ لڑکی جو مجھے کبھی غصے میں، تو کبھی روتے ہوئے ملی تھی آج میرے ہی الفاظ دہراتے ہوئے بڑی سنجیدہ اور صوبر لگ رہی تھی۔

''آپ واقعی ہر بار نئے روپ میں نظر آتی ہیں''، اس کے برابر والی لڑکی اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھی تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اور آپ ہمیشہ ہی کسی جن کی طرح نمودار ہوتے ہیں اور بنا بتائے غائب ہو جاتے ہیں''، اس کے سنجیدگی سے شکوہ کرنے پہ میں دھیرے سے ہنس دیا۔

''مجھے پہچاننے کے باوجود بھی اندر لائبریری میں ایسے کیوں ریکٹ کیا کہ جیسے آپ مجھے جانتی نہیں''، میں نے اپنے رُکنے کی اصل وجہ بتاتے ہوئے سوال کیا۔

''کیوں کہ میں آپ سے خفا ہوں''، منہ بناتے ہوئے اس نے جس انداز میں کہا مجھے وہ پہلی ملاقات والی لڑکی یاد آئی۔

''ہاں باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ آپ کافی بدل چکی ہیں لیکن آپ تو...''، میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔

''جی میں بدل گئی ہوں آپ کی باتوں نے واقعی مجھے سوچنے اور سمجھنے کا نیا رُخ دیا تھا لیکن آپ جانتے ہیں کچھ لوگ ہوتے ہیں جو ہماری زندگی میں کمفرٹ زون جیسے ہوتے ہیں آپ اجنبی تھے لیکن آپ سے بات کرنا آسان تھا''، اس نے آنکھوں میں آئی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''واقعی کچھ لوگ کمفرٹ زون کی طرح ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھار، کچھ اجنبی بھی زندگی میں ایسا نشان چھوڑ جاتے ہیں جو ہمیشہ یاد رہتا ہے''، میں نے اس کی آنکھوں میں جھلکتی سنجیدگی کو غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

تو مسٹر اجنبی، کیا اس بار بھی بنا بتائے غائب ہو جائیں گے؟'' وہ خاموش رہی، شاید میرے الفاظ کو تول رہی تھی۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

''شاید اب وقت آ گیا ہے کہ اجنبی پن کو ختم کر دیا جائے۔ میرا نام زاویار ہے اور آپ کا''، میں نے لمحہ بھر کے لیے آسمان کی طرف دیکھا، پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ وہ چونکی، پھر مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔ لائبریری کے در و دیوار اس نئی کہانی کے آغاز کے گواہ بن گئے تھے۔

☆☆☆☆☆

سرکش

ٹاپا ٹوہیا قدیم فارس کے ایک گاؤں اسیرستان میں رہتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کا نہایت ذہین بچہ تھا۔ ہر بات جلد سیکھ لیتا اور تمام احکاماتِ مقدس اسے ہمیشہ یاد رہتے۔ ٹاپا اپنے والد کا بے حد فرمانبردار تھا۔ ہر صبح پوجا گھاٹ جاتا اور ایک بہت بڑے مجسمے ''احتمال'' کے سامنے سر جھکاتا۔ احتمال کے ترجمان ''تیرہ'' کی ہر بات کو دل پر نقش کر لیتا۔ تیرہ کی کہی ہوئی سبھی باتیں اس کے ذہن میں ہر وقت گھومتی رہتی تھیں، جیسے:

''ہمیں اور ہمارے دل کو احتمال نے ریت سے بنایا ہے، سرکشیوں سے ہمارا دل بکھر جاتا ہے پھر اسے احتمال سمیٹ لیتا ہے اور ہمیں دوبارہ مہلت دیتا ہے کہ شاید ہم پھر سے اس کی تابعداری پر آجائیں۔ مردودوں کو ہوا سے بنایا گیا ہے۔ ہواریت کو اڑا لے جاتی ہے، ہمیں مردود سے بچنا چاہیے۔ ہر مرد کے سر کے اندر ایک مردود ہے اور دوسرا اس کے دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی میں ہے۔ اس لیے جب لڑکا دس سال کی عمر کا ہو تو اس کے دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ اور انگلی کٹنے والے دن کو کسی تہوار کی طرح منایا جاتا ہے، کہ یہ حکمِ یزداں ہے۔ اس عمل سے احتمال خوش ہو کر پورے قبیلے کی بڑی آفتیں چالیس دن تک ٹال دیتا ہے۔ عورت کے پاؤں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا، دونوں مردود اس کے سر میں رہتے ہیں۔ اسی لیے احتمال نے کہا ہے کہ ہر سو میں سے ننانوے عورتیں آگ میں جائیں گی۔ ہمیں عورتوں سے دور رہنا چاہیے اور کبھی ان سے کوئی مشورہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس پر مردودوں کا غلبہ زیادہ ہے۔

'یقین' احتمال کی طرف سے ہے اور ہر 'سوال' جو انسانی ذہن میں پیدا ہو، مردود کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان بہت زیادہ سوچے اور پریشان رہے، اسی لیے ہمیں زیادہ سوچنا نہیں چاہیے اور کبھی سوال نہیں کرنا چاہیے۔

آج چاند کی پہلی شام تھی سبھی لوگ پوجا گھاٹ کے باہر میدانِ ظلمت میں جمع ہوئے اور اپنی خاص مذہبی رسم ''پا کوبی'' کرنے لگے۔

اس میں ہر شخص دوسرے کے پاؤں پر لات مارتا ہے تا کہ چھوٹی انگلی کٹ جانے کے باوجود مردود کا جو اثر پاؤں میں رہ گیا ہے وہ زائل ہو جائے۔

بچے وہاں نہیں جاتے تھے لہٰذا ٹاپا جب بھی

محمد اویس

اپنے والد کے ساتھ وہاں آتا تو دروازے پر ہی کھڑا ہو جاتا اور دھیان سے لوگوں کو دیکھتا۔ لوگ ایک دوسرے کے پاؤں کو زور زور سے کچلتے۔ میدان میں ہر طرف شور ہوتا درد سے لوگ چیخ و پکار کرتے، لیکن احتمال کو راضی کرنے کے لیے دل و جان سے کوششیں کرتے۔ تیرہ چوں کہ ترجمانِ یزداں تھا، یعنی احتمال کے احکام اور ہدایات لوگوں کو سناتا تھا، اس لیے یہ خاص مذہبی رسم اس پر معاف تھی، اور اسے احتمال نے اپنی خصوصی عطا سے پاک کر دیا تھا۔ وہ میدان میں اونچے مقام پر کھڑا رہتا اور اس عمل میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا۔

تیرہ نے خطاب شروع کیا: ''لوگو! تم خوش نصیب ہو کہ احتمال نے تمہارے قبیلے کو اپنی خاص پوجا کے لیے چُنا ہے۔ تم چُنے ہوئے قبیلے ہو۔ احتمال تم سے راضی ہے۔ اسے راضی کرتے رہو۔ یہ چھوٹی سی قربانی اس کی راہ میں کچھ بھی نہیں۔ کیا اس کا اتنا سا بھی حق نہیں ہم پر؟ جس نے ہمیں ریت سے بنایا اور ہمارے دل کو ریت سے بنایا۔ پھر جب وہ بکھرنے لگا تھا تو اسے پانی سے جوڑا'' ایک آدمی میدان سے اوپر آیا اور آگ سلگوں کی تھیلی تیرہ کو تھما دی۔ تیرہ خوش ہوا ''آفریں۔۔ آفریں۔۔'' تیرہ بے ساختہ بولا۔ ''احتمال تمہارا بھلا کرے، تمہارے لیے سبز باغ ہیں۔'' پھر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ احتمال نے ہمیں یہ سارا جہان بنا کر دیا، ہمیں مزیدار کھانے دیئے، بھیڑ بکریاں دیں، پیڑ پودے دیئے، سیدھی زمین دی اور سیدھا آسمان، اگر وہ ہمارے لیے یہ زمین سیدھی نہ بناتا تو ہم نیچے گر جاتے۔ بے شک اس کے کاموں میں حکمتیں ہیں۔ برے کاموں سے اور عورتوں سے بچتے رہو، کہ یہ مردودوں کا راستہ ہے۔

ٹاپا سنتا رہا لیکن اس کی توجہ لوگوں کی جانب تھی جو بہت تکلیف میں تھے اس وقت اسے لوگوں سے بہت ہمدردی محسوس ہوتی لیکن یہ سوچ کر کہ وہ احتمال کو خوش کر رہے ہیں وہ خود کو تسلی دیتا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے والد 'پرستار' کے ساتھ گھر آیا۔ رات ہو چکی تھی۔ ٹاپا کے والد کو پیروں میں بہت تکلیف تھی۔ اس لیے اس کی والدہ 'نرملا' اس کے ابو کے پیروں میں مالش کر رہی تھیں۔ وہ شدید درد کی وجہ سے کراہ رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی پرستار کو یاد آیا کہ آج دوشنبے کی رات ہے تو فوراً اس نے ٹاپا کو پکارا۔ ''ٹاپا! آج کونسی رات ہے۔'' وہ چاند رات کہنے ہی لگا تھا کہ اسے کچھ یاد آیا۔ اور وہ زبان منہ میں دبا کر شرمندہ ہوا۔ وہ سر جھکا کر بولا دوشنبے کی رات ہے۔ پرستار نے پوچھا ''درخت کے نیچے دیا جلا کر رکھا؟'' ٹاپا نے کہا: ''وہ --- میں---- بھول گیا'' پرستار غصے میں چلایا: ''بہت ہی غیر ذمہ دار ہو گئے ہو، سارے گھر کو نحوست سے بھر دیا، جاؤ جلدی جا کر دیا جلا کر آؤ۔ گھر میں اگر کچھ بھی برا ہوا تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔''

ٹاپا دوڑا اور جلدی سے دیا لے کر پیپل کے بوڑھے درخت کے پاس آیا اور دیے کو جلا کے درخت کے بالکل ساتھ ہی رکھ دیا۔

جب وہ واپس آ رہا تھا تو اسے خیال آیا کہ کیا ہو اگر درخت دیے سے آگ پکڑ لے۔ اسے ڈر لگا اور وہ واپس درخت کی جانب آیا اور کیا دیکھتا ہے کہ درخت کے تنے کے قریب جو سوکھی ہوئی گھاس ہے اسے آگ لگ رہی ہے اس نے فوراً آگ بجھائی اور دیے کو درخت سے ذرا فاصلے پر رکھ دیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ٹھہر گیا۔ پھر وہ سوچنے لگا'' کیا یہ نقصان اس وجہ سے ہو رہا تھا کہ میں نے سورج ڈھلتے ہی یہاں دیا نہیں رکھا تھا، یا پھر یہ نقصان اس لیے ہو رہا تھا کہ میں نے دیے کو بے دھیانی سے رکھا؟''

اس نے آنکھوں کو بڑا کیا پھر کچھ سوچا کہ:'' ہم اس نقصان سے بچ کیوں گئے؟ کیا اس لیے بچے کیونکہ ہم احتمال کو راضی کر کے آئے ہیں یا پھر اس وجہ سے، کہ میں نے اس بارے میں سوچا اور غور کیا۔'' پھر اسے خیال آیا کہ'' تمام سوالات مردود کی طرف سے ہیں'' پھر اس نے سوچوں کو جھٹک دیا اور اندر چلا گیا۔

اگلے ہی دن ٹاپا کے پاؤں کی چھوٹی انگلی کٹنے کی رسم تھی۔ سبھی محلے دار، رشتہ دار جمع ہوئے اور پرستار کو مبارک دینے لگے کہ بیٹے کی رسم ادا کر دائی۔ تیرہ کو بھی بلایا کہ کوئی بھی رسم جو احتمال کی خوشی کے لیے ہو، وہ بغیر اس کے ترجمان کے کیسے ادا کی جا سکتی ہے۔ تیرہ نے وہاں خطاب بھی کیا:'' آفرین--- آفرین---- احتمال تم سب سے راضی ہو۔ 'پرستارِ یزداں' ہمارے قبیلے کا بہت اچھا فرد ہے وہ احتمال کی خوشنودی کے لیے ہمیشہ سرگرم رہتا ہے۔ اس وقت کو یاد کرو جب اس کے پاس کافی ساری مرغیاں تھیں اور ڈھیروں انڈے۔ وہ سب کچھ بیچ کر اس نے کافی ساری دولت اکٹھا کی تھی لیکن اس نے احتمال کی رضا کے لیے سب کچھ قربان کر دیا اور پوجا گھاٹ کو نئے سرے سے تعمیر کروایا۔ آج اس کے شہزادے کی رسم ہے امید ہے اس سے خوش ہو کر احتمال اسے اور دے گا اور تمام قبیلے کی بلائیں چالیس دن تک ہٹا دے گا۔''

رسم شروع کی گئی، قصائی نے ٹاپا کے پاؤں کی چھوٹی انگلی کاٹی۔ اسے شدید تکلیف ہوئی اور وہ درد سے رونے، چلانے لگا۔ اسے تیرہ نے حوصلہ دیا:'' رو نہیں بچے! اب تم سے ایک مردود جدا ہو گیا ہے، تم نے بندگی کا بڑا حق ادا کر دیا۔ یہ تم نہیں رو رہے تمہارے اندر کا دوسرا مردود رو رہا ہے، سکون رکھو بچے۔ ٹاپا مسلسل رو رہا تھا۔ تیرہ نے پانی پر کچھ پڑھا اور کہا اسے لڑکے کے سر پر بہا دو۔ انھوں نے بہا دیا۔ کچھ پانی اس کی ناک میں بھی گیا جس سے اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی اور وہ رونے، چلانے کے ساتھ ساتھ کھانسنے بھی لگا۔ تیرہ نے کہا بچہ مردود پر قابو نہیں کر پا رہا اسے نیند والے پتے کھلا دو۔ ٹاپا کو ایک پودے کے پتے پیس کر کھلائے گئے اور اسے نیند آنے لگی۔ اسے لگ رہا تھا ارد گرد کا ماحول مدھم ہوتا جا رہا

ہے۔اس کی آنکھیں بھاری ہونے لگیں، اسے ہلکی آواز میں لوگوں کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی اپنے بچوں کی رسم کا قصہ سنا رہا تھا تو کوئی اس رسم کی حکمتوں پر گفتگو کر رہا تھا۔ ایک بات جو اسے نئی لگی وہ یہ تھی کہ کچھ لوگ ایک شخص کے بارے میں بات کر رہے تھے کہ ''وہ عجیب عجیب باتیں کرتا ہے، ہماری رسموں کی مخالفت کرتا ہے، ''سوچ ونت'' پاگل ہے.....'' سنتے سنتے ٹاپا کو نیند آ گئی۔

جب وہ جاگا تو سب جا چکے تھے وہ لیٹا ہوا تھا اور اس کے ماں باپ کام کاج میں مصروف تھے اس نے ماں کو بلایا ''امی...''

''جی بیٹا! درد ہو رہا ہے؟''

''ہاں بہت---''

''ٹھیک ہو جائے گا بیٹا۔ سبھی کو اس درد سے گزرنا پڑتا ہے نا۔ بس کچھ ہی دنوں میں صحیح ہو جاؤ گے۔''

''امی ایک بات پوچھوں''

''جی میرا بچہ ضرور''

''امی 'سوچ ونت' کون ہے؟''

امی چونک کر: ''سوچونت.....!! کہاں سے سنا۔ کوئی نہیں ہے، میں نہیں جانتی۔''

پرستار نے ان کی بات چیت سن لی اور آ کر کہا: ''کیوں چھپاتی ہو ٹاپا سے''

میں بتاتا ہوں بیٹا ''سوچ ونت کبھی احتمال کا بڑا بھگت تھا، اور تیرا سے پہلے وہی ترجمان تھا۔ سب اس کی بندگی کی مثالیں دیتے تھے۔

پھر اسے علم حاصل کرنے کے لیے بغداد جانے کا موقع ملا۔ وہ ایک قافلے کے ساتھ گیا۔ وہاں اس نے طب فلسفہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ پڑھا۔ قافلہ تو چھ ماہ میں لوٹ آیا۔ لیکن وہ کئی سال وہیں پڑھتا رہا۔ پھر جب وہ سالوں بعد واپس آیا تو بالکل بدل چکا تھا، بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ بڑوں کے رسم و رواج کو غلط کہتا تھا۔ ہر شے پر سوال اٹھاتا تھا۔ اس کی باتیں سن کر سب کو صدمہ لگا۔ تیرہ نے کہا ہے کہ: سوچ ونت بہت نیک تھا لیکن مردود کے حملے سے نہ بچ سکا اور اب اس کے منہ سے مردود بولتا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر مردود حاوی ہو چکا ہے''

''ابو۔ لیکن وہ عورتیں اس کے بارے میں کیا کہہ---''

''وہ کہہ رہی تھیں کہ سوچ ونت کہتا ہے کہ: کوئی مردود نہیں رہتا پیروں میں، کیوں معصوم بچوں کی انگلیاں کاٹتے ہو؟'' ''سوچ ونت پاگل ہو چکا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ حکم یزداں ہے۔ اس پر کیسے سوال اٹھاتا ہے، اور تو اور 'پا کوبی' پر بھی--- الغرض کے ہر حکم پر ہی وہ اعتراض کرتا ہے۔ کئی لوگ تو اس کے بہکاوے میں بھی آ جاتے ہیں۔ اور عبادتیں کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں، تم اس سے دور ہی رہنا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں بھی بہکا دے۔ بہت رات ہو چکی ہے، اب تم آرام کرو، پھر صبح باتیں کریں گے، سو جاؤ شاباش۔''

پرستار کمرے کا دیا بجھا دیتا ہے، اور چلا جاتا ہے۔ ٹاپا کو نیند نہیں آتی وہ دیر تک سوچتا رہتا ہے۔ اسے خیال آتا ہے ''کیا کوئی علم حاصل کر کے ایسا بھی بن سکتا ہے کہ احتمال کے حکموں کو

ہی ٹھکرا دے۔ کس لیے۔۔؟ کیا عبادات ہی اصلِ زندگی نہیں۔ ؟ کیا ہمیں اسی کے لیے ہی پیدا نہیں کیا گیا؟ تیرہ یہی تو کہتا ہے، لیکن اگر تیرہ سچا نہ ہوا۔۔۔؟ نہیں۔۔۔!! یہ میں کیا سوچ رہا ہوں، یقیناً یہ خیال مردود کی طرف سے تھا۔ مجھے زیادہ سوچنا نہیں چاہیے۔ بیشک سارے سوالات اسی کی طرف سے ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے ایک بار اسے دیکھنا تو ضرور چاہیے، لیکن اگر وہ مجھے گمراہ کر دے تو؟ نہیں۔ مجھے گمراہ نہیں کر سکتا، میں نے تو مردود والی انگلی بھی کٹوا دی ہے۔ آہ ۔۔۔ یہ بہت تکلیف دہ ہے۔'' ٹاپا کچھ دیر کے بعد سو گیا۔ کئی دن گزرنے کے بعد ٹاپا اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گیا۔

سحر کا وقت تھا۔ زور زور سے مرغے کی بانگ سنائی دے رہی تھی۔ ہر طرف ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ٹاپا کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا کہ افق کی لالی سے ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ اس نے کہا: شکرِ یزداں کہ مجھے سویرے ہی جگا دیا کہ میں اس کی قدرت کے حسین نظارے دیکھ سکوں۔ بیشک سبھی اچھائیاں سحر کے وقت ہی اترتی ہیں اور ان لوگوں میں بانٹی جاتی ہیں جو سویرے اٹھتے ہیں۔

ساری مرغیاں خیرات میں دی جا چکی تھیں۔ اس لیے اس کی ماں نے اسے باہر سے انڈا لانے بھیجا۔ ابھی پوری طرح روشنی نہیں ہوئی تھی، بازار بند تھا، اس لیے ٹاپا کو کہیں سے بھی انڈا نہیں مل رہا تھا۔ وہ پوچھتے پوچھتے دور پہنچ گیا۔ مایوس ہو کر واپس آ ہی رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک ادھیڑ عمر کا خوش شکل آدمی نظر آیا۔ وہ شخص پہلے اس کی طرف دیکھتا پھر اس کے لنگڑاتے ہوئے پاؤں کی طرف ۔ وہ شخص بولا: اے بچے! کیا ڈھونڈتے ہو؟ کھو گئے ہو کیا؟

ٹاپا بولا: ''نہیں چچا! میں تو انڈے لینے گھر سے نکلا تھا۔ سارا بازار بند تھا، تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آ گیا۔ پر ملے ہی نہیں تو بس میں واپس جا رہا ہوں''

''رکو بیٹا''

وہ شخص ایک حجرے میں گیا اور انڈوں کی ایک تھیلی بھر کر لایا اور ٹاپا کو تھما دی۔ ٹاپا نے کہا: ''میرے پاس اتنے سارے انڈوں کے لیے تو پیسے نہیں ہیں!''

''میں ان کے پیسے تھوڑی مانگ رہا ہوں، تم انھیں میری طرف سے ہدیہ سمجھ لو''

ٹاپا پہلے تو ہچکچایا لیکن اصرار پر اس نے رکھ لیے۔ اور کہا: ''شکریہ، آپ بہت اچھے ہیں۔''

وہ شخص مسکرایا اور پوچھا: ''کس کے بیٹے ہو''

ٹاپا: ''پرستار کا''

''اچھا! میں تو تمھارے ابو کو جانتا ہوں، اب تمھیں گھر جانا چاہیے''۔

ٹاپا خوشی خوشی گھر پہنچا اور امی کو انڈے دکھائے اس کی ماں اتنے انڈے دیکھ کر حیران ہوئی اور پوچھا: کہاں سے لائے اتنے سارے انڈے؟

''امی! ایک بہت اچھا آدمی تھا اس نے یہ سارے مفت میں دے دیئے''

''آدمی؟ کونسا؟ کیا نام تھا اس کا؟''

''نام تو میں نے پوچھا ہی نہیں لیکن ہاں اس نے کہا کہ وہ ابا کو جانتے ہیں''

''اچھا تمہارے ابو کے دوست ہوں گے، لاؤ میں بنا دیتی ہوں''

شام کے وقت ٹاپا اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے میدان کی طرف گیا۔ راستے میں اس نے ایک ہجوم دیکھا۔ ٹاپا کو تشویش ہوئی کہ وہ لوگ کس وجہ سے جمع ہوئے ہیں۔ جب وہ قریب گیا تو دیکھا وہی سفید بالوں اور سفید داڑھی والا خوبرو شخص (انڈے ہدیہ دینے والا) کچھ کہہ رہا ہے اور لوگ اسے سن رہے ہیں۔ ٹاپا نے اپنے دوست سے پوچھا: ''یہ آدمی کون ہے؟''

دوست بولا: ''تم نہیں جانتے اسے''

''نہیں''

''ارے یہ 'سوچ ونت' ہے۔ اس کے پاس نہیں جانا ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے، یہ احتمال کو ہی نہیں مانتا'' ٹاپا حیران ہوا: ''نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے، یہ تو اچھا آدمی ہے، اگر یہ احتمال کو نہیں مانتا تو اس نے میری مدد کس لیے کی؟ دوست ٹاپا کو کھینچ رہا تھا: ''چلو، یہاں نہیں رکنا چاہیے'' ٹاپا: ''نہیں مجھے سننے دو یہ کیا کہہ رہا ہے''

سوچ ونت کہہ رہا تھا: ''کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ تمہارا مالک تمہیں کیوں تکلیف دے گا؟ تمہیں دکھ دے کر اسے کیا ملے گا؟ تیرہ جھوٹ بولتا ہے، کبھی اسے کوئی غیبی آواز نہیں آئی، نہ ہی مجھے آتی تھی۔ یہ ایک دماغی خلل ہے، جس سے لوگوں کو لگتا ہے کہ انہیں کوئی آواز آتی ہے، حالانکہ وہ آواز ہمارے اپنے دماغ کی ہوتی ہے۔ لوگ معصوم ہیں، وہ بغیر دلیل کے، کسی بھی چیز پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ لوگوں کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کوئی متبادل نظریہ نہیں اس لیے وہ تیرہ جیسے لوگوں کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ لوگو! جان لو کہ زندگی میں فلاح پانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ علم حاصل کرتے رہو اور عقل سے فیصلے کرو، کسی ایسے آدمی کو اپنا رہبر نہ بناؤ جو عقل کے خلاف باتیں کرے۔ سدا تمارا بھلا ہو''

سوچ ونت اپنا خطاب کر کے چلا گیا۔ ٹاپا شش و پنج کی حالت میں وہیں ٹھہرا رہا۔ عقائد اور نظریات کی دیواریں جب ڈہنے لگیں، تو عدم اور وجود کا فرق دھندلا ہو جاتا ہے۔ کیا حقیقت ہے اور کیا فریب سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ ٹاپا سوچوں میں گم سم، گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس خیال سے بے خبر کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ گھر پہنچ کر وہ نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ اور خیالوں میں کھو گیا۔ اس کی امی اسے دیکھ کر ذرا مخمصے کا شکار ہوئی اور آ کر اسے پیار سے پکارا: ''بیٹا'' ٹاپا نے نہیں سنا، امی نے پھر سے پکارا: ''ٹاپا بیٹا! کوئی پریشانی ہے کیا؟''

ٹاپا: ''نہیں امی''

امی: ''کیا سوچ رہے ہو؟''

ٹاپا: ”امی! تیرہ کو احتمال کے سارے حکم کیسے پتہ لگتے ہیں؟“

امی: ”بیٹا وہ ان سے بات کرتے ہیں“

ٹاپا: ”امی ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے یا انھیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے؟

امی اس کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی: ”ایسا نہیں کہتے ٹاپا- یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کس نے کہا تم سے ایسا؟ تیرہ بھی اپنے دل سے بات نہیں کہتا وہ وہی کچھ سناتا ہے جو اسے احتمال نے کہا ہو-“

ٹاپا: ”پھر اس نے تو کہا ہے کہ مجھے کسی عورت سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے“

امی غصے سے اٹھیں اور وہاں سے جانے لگیں- اپنے منہ بڑبڑاتے ہوئے: ”ضرور کسی بری صحبت میں پڑ گیا ہے، میرے مالک اس کی حفاظت کر“

جب پرستار گھر آیا تو اس کی بیوی نے اسے ٹاپا کی یہ سب باتیں بتائیں جس سے وہ بھی بہت پریشان ہوا اور اس نے ارادہ کیا کہ صبح ٹاپا کو تیرہ کے پاس لے جائیں گے تاکہ اس کے شکوک و شبہات دور ہو سکیں-

صبح سویرے روشنی ہونے سے کچھ پہلے نرسنگھا بجنے کی تیز آواز سنائی دی- نرسنگھا بجنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ احتمال نے رات کو کوئی پیغام اتارا ہے- پرستار اٹھ کر تیار ہوا اور ٹاپا کو بھی تیار کیا- دونوں جب میدان ظلمت میں پہنچے تو وہاں ایک ہجوم جمع ہو چکا تھا- پرستار بھی ایک کونے میں آ کر بیٹھ گیا، اور ٹاپا کو اپنے ساتھ بٹھا لیا-

تیرہ نے خطاب شروع کیا: ”میں تم سب کو مبارک دیتا ہوں کہ احتمال کے حکم پر تم سب چلے آئے- رات میں نے بیداری کے عالم میں ایک سونے کے تخت پر احتمال کو دیکھا-

ہجوم میں شور مچ گیا ”آفرین--- آفرین--“

تیرہ: ”بھلا ہو تمھارا، شکریہ--- شکریہ-“

”رات کو سونے کے تخت پر احتمال نے مجھ سے فرمایا کہ اگر کسی قوم میں سرکشوں کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ قوم تباہ ہو جائے گی- میں نے بے ساختہ عرض کیا ”میرے مالک--- کیا سوچ وَنت؟“

احتمال نے فرمایا: ”ہاں“ اور وہ غائب ہو گیا- لہٰذا مالک کے حکم کو پورا کرتے ہوئے سورج نکلنے سے پہلے پانچ تگڑے جوان سوچ ونت کو پکڑ کر لائیں اور اسے سولی پہ چڑھا دیا جائے- ہجوم میں نعرے لگنے لگے ”احتمال زندہ باد، احتمال زندہ باد“ کئی رضا کار اٹھے اور سوچ ونت کے چہرے پر سیاہ کپڑا چڑھا کر اس کے ہاتھ باندھ کر اسے لے آئے اس کے آخری الفاظ جانے بغیر ہی اسے سولی پر چڑھا دیا گیا- وہ تڑپنے لگا- ٹاپا بے اختیار چیخنے چلانے لگا ”روکو، رک جاؤ“ وہ اٹھ کھڑا ہوا- اس کی آواز ہجوم کے شور میں گم ہو گئی اور کسی کو سنائی نہیں دی- پھر پرستار نے اسے ہاتھ سے پکڑا اور نیچے بٹھا دیا-

☆☆☆☆☆

سرعام روٹی (مائکروف)

شہزاد نیّر

وہ حسب معمول تیز تیز پیڈل مارتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔اچانک اس کی بائیسکل روک لی گئی۔

"پہلے ہی فیکٹری سے لیٹ ہو رہا ہوں" اس نے بے بسی سے سوچا

"کیوں روکا بھائی" وہ ہجوم کے تیور دیکھ کر خوفزدہ سا ہو گیا۔

اچانک ایک تھپڑ اس کے گال پر پڑا جس کے زور نے اس کی گردن گھما کے رکھ دی۔ ایک شخص بائیسکل کے کیریئر سے ٹفن باکس کھول رہا تھا۔

"رمضان میں روٹی لے کر جا رہے ہو----روزہ خور---"

ایک تھپڑ اور----

"بھائی میں تو---"

کسی خوف سے وہ رک گیا

"ہاں بول بول تو تو---؟

"میں بیمار ہوں" مشکل سے اس کے منہ سے نکلا

"بیمار ہے تو گھر بیٹھ، یوں سرعام روٹی لے کر کیوں جا رہا ہے۔ رمضان کا کوئی احترام نہیں تیرے دل میں؟

بھائی معاف کر دو۔ میں بیمار ہوں" وہ منمنایا

"دفع ہو جا---" یہ سنتے ہی وہ بھاگا

دل ہی دل میں خداوند کا شکر ادا کرتا رہا کہیں اس کے منہ سے اگر یہ نکل جاتا کہ میں مسیحی مذہب سے ہوں تو خدا جانے کیا ہوتا۔

☆☆☆☆☆

Wind Chimes

فاطمہ کی بلال سے فون پر جب غیر متوقع طور پر ایک گھنٹے سے زیادہ طویل بات ہوگئی تو فون بند کرنے کے بعد اس کو یقین نہ آیا کہ بلال سے اتنی باتیں بھی کی جا سکتی تھیں۔ اس نے سوچا کہ فوراً اپنی سہیلی حنا سے بات کرے اور اس کو کچھ بتائے، کچھ پوچھے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اچانک کسی کی زندگی میں آئے اور پھر اس کے ساتھ اتنی طویل باتیں کیسے کر سکتا ہے، کیوں کر سکتا ہے، نہ کوئی مفاد وابستہ نہ کوئی شرط زندگی۔ اور نہ ہی دیوانے پن کی کہیں کوئی ابتداء---- تو پھر ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔

یہ سوچ کے اس نے حنا کا نمبر نکالا اور وٹس ایپ وڈیو کال کرنے لگی---- تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے اردگرد بلال کی باتوں کے فسوں کی ایسی خوشبو اور ایسی روشنی سی پھیل گئی ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے وہ حنا سے بات نہیں کر پائے گی اور اسی خوشبو اور روشنی میں خود کو بے خبر اور بے سدھ پاتے ہوئے اس نے فون کو ایک سائیڈ پر رکھ دیا---- دوسری جانب سے حنا کی "ہیلو --- ہیلو" کی آواز اس کے کانوں میں آتی رہی لیکن وہ بلال کی باتوں کی مٹھاس کو روشنی کی صورت اپنے اندر سے پھوٹتے دیکھتی رہی ---- مسکراتی رہی --- آنکھیں بند کیے بے خبر رہی اور، بلال اور اس کی باتوں کی ونڈ چائم Wind chimes میں گھری رہی، آدھی جاگتی اور آدھی سوتی رہی اور سوچتی رہی کہ حنا کو بتاؤں گی کہ محبت اپنی اصالت میں Wind Chimes ہے، ایک جھنجھنا ہے جو انسان کے اندر سے لہروں کی صورت میں بجتی اور پھوٹتی ہے اور پھر ہر طرح سے اسکو اپنے حصار میں لے کے اندھا، گونگا اور بہرہ کر دیتی ہے---- اور میں اسی لیے تمہیں اس روز کال کا جواب نہیں دے پائی------

اگلے دن کچھ ایسا ہی ہوا، حنا کا فون نہیں آیا بلکہ وہ خود آگئی اور اس نے دیکھا کہ فاطمہ بالکل ٹھیک ہے، آرام سے اپنے کمرے میں فون پر مگن ہے۔ حنا نے اس کو کال کیا، فاطمہ نے اس کی کال پک نہیں کی بلکہ فون کو تب تک دیکھتی رہی جب تک فون بند نہیں ہو گیا--- حنا نے اس کے سامنے جا کر حیران ہو کر اونچی آواز میں کہا کہ اندھی، گونگی اور بہری بھی ہوگئی ہو کیا اب---- تو فاطمہ نے قدرے حیرت سے اس کو دیکھا اور کہا: ہاں----- مجھے اس ونڈ چائم Windchime کے ہوتے ہوئے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ حنا نے اس جانب دیکھا جس طرف فاطمہ نے اشارہ کرتے ہوئے ونڈ چائم کہا تھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا---- صرف فاطمہ کی آنکھیں تھیں مگر چمک اب کے ہیرے کی سی تھی۔ مسکراہٹ تھی جس کی جھلمل حنا نے پہلے بھی نہ دیکھی تھی اور اب وہ فاطمہ کے پاس سر جھکائے بیٹھی منتظر تھی کہ وہ کب اس کافی شاپ کا قصہ سنانا شروع کرے جہاں سے واپس آ کے، اس کے بھی فون پک نہیں کر رہی، مطمئن بھی ہے اور کینڈین کافی شاپ کے ملکیجے سے ڈونٹس کے ساتھ ساتھ میٹھی میٹھی سی روشنی بھی اپنے ساتھ لے آئی ہے ---- اور بتائے کہ اس کے کمرے میں کہاں پہ ونڈ چائم ہے --- جس کے نہ ہوتے ہوئے بھی فاطمہ اس کو سن رہی ہے---- اور حنا کی کالز آنے کے باوجود، فاطمہ ان کالز کو نہ دیکھ رہی ہے اور نہ سن رہی ہے---

☆☆☆☆☆

بشریٰ شیریں

شناخت کی تلاش

''ہمیں بچہ چاہیے۔''

''آپ لوگ استقبالیہ پر میری معاون سے ملیے وہ آپ کو ساری معلومات دے دے گی۔''

''محترمہ ہمیں بچہ چاہیے ڈاکٹر صاحب نے آپ سے ملنے کا کہا ہے۔''

''یہ کچھ تفصیلات ہیں آپ وہاں تسلی سے بیٹھ کر دیکھ لیں۔''

استقبالیہ پر کھڑی دُبلے پتلے نقش کی بے زار لڑکی نے نہایت بے رُخی اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ ساری معلومات انھیں تھما دیں۔

دونوں ان کارڈز کو بہ غور پڑھنے لگے۔ کچھ دیر بعد دونوں لڑکی سے گویا ہوئے: ''ان کارڈز میں بچے کی جو خصوصیات لکھی ہیں کیا ہمیں واقعی ایسا بچہ ملے گا؟''

''جی بالکل اور اگر آپ چاہیں تو اپنی مرضی کے مطابق بھی مصنوع تیار کروا سکتے ہیں مگر اس کی قیمت چار گنا ہوگی۔''

''ہم یہی کارڈز لے جا سکتے ہیں تاکہ تسلی سے کسی حتمی نتیجے تک پہنچ سکیں۔''

''کیا آپ کے پاس اتنا فارغ وقت ہوگا؟'' استقبالیہ پر کھڑی لڑکی نے تعجب سے سوال کیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''آآآ--- یہ تو--، ٹھیک ہے پھر آپ الف درجہ میں دوسرے نمبر والی خصوصیات والا بچہ تیار کروا دیجیے۔'' عورت نے مرد کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے اپنا مطالبہ بیان کیا۔

''بالکل ٹھیک ہے لیکن کام تسلی بخش ہو کسی قسم کی کوئی کمی بیشی نہ رہے۔ پیسے کی فکر نہ رکھیں۔ مزید اس میں---''

''آپ مطمئن رہیے اور جو ردوبدل چاہیے اسے اس صفحے پر درج کر دیجیے۔''

''ڈاکٹر صاحب ہم نے جو درجہ منتخب کیا تھا اس میں بچے کا چہرہ گول تھا اور ناک اس طرح لمبی نہیں تھی۔ میری بھی نظر آج دو ماہ بعد پڑی ہے وہ تو شکر ہے پتا چل گیا---''

''دیکھیے آپ نے جس کیٹیگری میں جو کریکٹرسٹکس مزید کہیں تھیں اس کے لیے کچھ جینز کی مداخلت پر ایسا ہو گیا ہوگا۔ جینز میں میوٹیشن ہو گئی ہوگی۔''

''جو بھی ہے ہمیں یہ نہیں چاہیے ہماری مطلوبہ مصنوع تیار کروائیے۔'' عورت نے ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے نہایت غصے سے کہا اور چلتی بنی۔

''سر اس کا کیا کریں؟''

''کیا کر سکتے ہیں، اس پر رعایتی قیمت کی پرچی لگا کر سیل میں شامل کر دو۔''

''لیکن سر پچھلے تین ماہ کی مصنوعات بھی ابھی ہیں اور ان کی عمریں بھی---''

''کوئی نہیں آپ انھیں مزید رعایتی قیمت پر دیں۔''

معاون ''جی سر'' کہہ کر دروازے کی طرف مڑی ہی تھی کہ ڈاکٹر نے کہا: ''مزید ایک دو ہفتے دیکھ لیں، نہیں تو دو سے تین ماہ کے بچوں کو ضائع کر دیں'' ڈاکٹر نے مثبت سوچ کر فیصلہ کیا اور اگلے مریض کو سننے لگا۔

☆☆☆☆☆

ابنِ حسین شعیب الرحمٰن

سحری مبارک

''آپ روزہ نہیں رکھتے؟
''کبیر'' نے رازدارانہ اور پُرتحیر انداز میں آہستہ سے پوچھا؟
میں نے نفی میں سر ہلایا
''کیوں---؟
''میرے بھائی—'' ہم نے تو جون اور ''ہاڑ'' کے روزے رکھے ہیں۔ آخر اس استفسار کی نوبت کیوں پیش آئی؟
''کبیر---'' دراصل ہر کوئی چہ مگوئیاں کر رہا تھا''
''کیا--- چہ مگوئیاں---؟
''یہی کہ خدانخواستہ آپ روزہ نہیں رکھتے''
''یہ تو خالصتاً میرا اور میرے خدا کا معاملہ ہے''
''یار آپ بھی بہت سادہ ہیں۔ بل کہ پچھلی صدی کے لگتے ہیں''
''آپ سیدھی طرح بتائیں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟
''مانا آپ ماشاء اللہ سے صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں لیکن---
''لیکن کیا---؟
''آپ سحری کے لیے اٹھتے وقت صرف اتنی سی زحمت کیا کریں کہ سوشل میڈیا کے گروپ میں صرف ایک میسج سب دوستوں کو کر دیں۔
''کون سا---؟
''سحری مبارک کا!
''اچھا--- حیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے روزہ میرے لیے ہے--- اس میں کسی کو بتانا--- چہ معنی---؟
''یار تم تو بالکل ناک کی سیدھ میں چلتے ہو۔ کچھ دنیاداری بھی رکھنی پڑتی ہے''
''دنیاداری، اور وہ بھی دین میں!
''ہاں جی دنیاداری ہی کی خاطر--- سحری مبارک کا میسج ---
سحری مبارک کی میسج

☆☆☆☆☆

عاصم بخاری

سامانِ شگفتِ جاں

مرے جاں تاب مہتابو!
تمھاری زندگانی کی
ہلالی رُت
بڑی شدت سے یاد آتی ہے

تم میری نگاہوں میں
اُمڈتی چاہتوں کے
ایک ہلکے سے اشارے پر
قلانچیں بھرتے آتے تھے
مری گردن میں
اپنی ننھی منی نرم باہیں ڈال کر
مجھ سے لپٹ جاتے تھے

کیسے والہانہ،
کس قدر بے اختیارانہ
مری آغوش میں آتے
مرے اک اک بُنِ مُو میں
سماتے تھے
سماعت اُس گھڑی

تینوں دلوں کی دھڑکنیں
اک ساتھ سنتی تھی

سواری کے لیے
کس دھونس سے
گھوڑا بنا لیتے تھے ابُو کو
تھکن ساری اتر جاتی تھی لمحوں میں

سرِ شب نیند سے پہلے
تم اپنی پیاری ماما (میری مانا)
اور میرے درمیاں
حیرت بھری معصوم باتوں،
سادہ و مشکل سوالوں کا
چمن آباد کر دیتے تھے
تن من شاد کر دیتے تھے

اک سیلاب یادوں کا
دروں یلغار کرتا ہے
دل اِس خواہش سے بھرتا ہے

جلیل عالی

کسی تدبیر لوٹ آئیں
رسیلی عمر کے وہ دن
کبھی واپس جو آ سکتے نہیں
کیسی پگلائی تمنا ہے!

مرے احساس پر
کچھ بے دلی طاری بھی ہوتی ہے
مگر یہ سوچ کر
جی کو قرار آتا ہے
سرشاری بھی ہوتی ہے
کہ ناممکن اگر ممکن بھی ہو جائے
وہ موسم لوٹ بھی آئے
تو تم دونوں نے اپنے گرد
جو جھرمٹ ستاروں کا بسایا ہے
محبت کے دھنک رنگوں کا
جو میلہ لگایا ہے
زوالِ عمر کے صحرا میں
یہ سرسبز نخلستاں
خیابانِ بہشتِ دل
یہ سامانِ شگفتِ جاں
کہاں ہوگا!

نظم

اسے کہنا،

مری جاں! ضابطوں کی ایک دنیا ہے

قرینہ معنی رکھتا ہے

سلیقہ داد پاتا ہے

تغیر یوں نہیں آتا

کہ حیرت کی حدود بے گماں

بے حد پشیماں ہوں

اسے کہنا!

زمانہ رنگ سے بے رنگ تو ہوتا ہی رہتا ہے

ٹھٹھرتے موسموں کی شدتیں گرمی میں

ڈھلتی ہیں

خزاں آلود جھکڑ آفت جاں بنتے رہتے ہیں

تپش کی جان لیوا ساعتوں کا تند خو لہجہ

کسی بادِ بہاری کے نظارہ ہائے دلکش سے

بدلتا اور سنورتا دیکھا جاتا ہے

خزاں چولا بدلتی ہے، بہارِ جانفزا

اک روز دامن جھاڑ دیتی ہے

تپش آموز ہوتی ہے

اسے کہنا!

مری جاں! یہ شب و روزِ زمانہ جب

بدلتے ہیں

نئے قالب میں ڈھلتے ہیں

نیا سانچہ توانائی کی نوخیزی دکھاتا ہے

تو تبدیلی کے صدیوں سے مروج ضابطے

توڑے نہیں جاتے

اسے کہنا!

یہ حیرت ہے

کہ اس نے رنگ سے بے رنگ ہونے

کا عجب منظر دکھایا ہے

وفا کی دلکشی کو

منظرِ بے ڈھب بنایا ہے

ستم خیزی کا تیرِ بے اماں یکسر چلایا ہے

جفا کا روپ پایا ہے

کہ قلبِ ناتواں کو مضمحل ہونے کی تہمت

سے رلایا ہے

سید ریاض حسین زیدی

اسے کہنا!

وہ خود سوچے

کوئی تو ضابطہ، آہنگ، رشتہ سامنے رکھے

محبت کا بھرم رکھے

وفا کو بے وفائی کے قیامت خیز منظر میں

نہ یوں بدلے

کہ حیرت خیز آنکھیں ساکت و بے جان ہو جائیں

کلیجے دھڑکنوں کی لذتوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں

فراواں شوق کو بے ذوق ہونے کا عذاب آئے

اسے کہنا!

کہ اس کی بے رخی و بے وفائی کا عجب منظر

اداسی کا قیامت خیز نظارہ دکھاتا ہے

کسی کو خون کے آنسو رلاتا ہے

اسے کہنا!

کہ اس کا یہ چلن۔ بے چہرگی کی بدنمائی سے

بھی ڈرتا ہے

کسی بھی ضابطے، سانچے کے کینوس میں

نہیں سجتا

ستم اس کو نہیں جچتا

ایک منٹ کی خاموشی

کئی سال پہلے پاکستان میں زلزلے میں
مرنے والوں کی یاد میں عالمی فورم میں
ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی

ایک منٹ کی خاموشی
ان لوگوں کی یاد میں تھی
جن کے اندر جا اتری
موت کی گہری خاموشی
جن کی ہستی پل بھر میں
لمبی چُپ میں ڈوب گئی
ملبے میں جو دفن رہے
جن پر سکتہ ہے طاری
جن پر عمر فانی کا
اک اک لمحہ ہے بھاری

☆

دنیا کے ہمدردوں نے
ان سے بطورِ ہمدردی
کتنی مشکل سے کاٹی!
ایک منٹ کی خاموشی

ذرا سوچ لو یہ

جو تم نے سمیٹا نہیں مجھ کو اس زندگی میں جو
میں روز ہی اس طرح سے بکھرتا رہا تو
تمہیں ایک زحمت بہت جلد کرنا پڑے گی

ذرا سوچ لو یہ،
مری خاک کو تُم
سمیٹو گی کیسے!

نسیمِ سحر

پری خانہ

یہ دھرا ہے لمس
یہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے
یہاں رکھی ہوئی ہیں ہونٹ کی ترشی ہوئی قاشیں
یہاں پہ ساحلوں کو گدگداتے پاؤں رکھے ہیں
کسی کھونٹی سے پورے جسم کی خوشبو لٹکتی ہے
ہنسی رومال میں چٹکی پڑی ہے
لبالب حسن کی مٹکی پڑی ہے

میں پری خانے میں جاتا ہوں کبھی

ایک بے بس دن گزرتا ہی نہیں
ایک بے کل شام جاتی ہی نہیں
کچھ توجہ خواب فرماتے نہیں

جو چلے جاتے ہیں آتے ہی نہیں

وقت سے کہہ دو
ذرا بیٹھے
بلاتا ہوں ابھی
میں پری خانے سے آتا ہوں ابھی

انتظار کی تیسری نظم

ہماری بات ہو چکی ہے باغ سے
ہماری بات ہو چکی ہے وقت سے
ہماری بات ہو چکی ہے
کاسنی درخت سے.....

تم آسکو تو باغ تم کو دیکھنے کو بے قرار ہے
تم آسکو تو پھول بے شمار ہیں
تم آسکو تو وقت بے حساب ہے.....

تمھارا انتظار ہے.....

منظر اعجاز منظر

انتظار

احمد جلیل

سہانے موسموں کی راہ تکتے
مری آنکھیں بھی اب پتھرا گئی ہیں
مری آشاؤں کی کلیوں کے اوپر
خزائیں ہی خزائیں چھا گئی ہیں
سہانے موسموں کے راستوں میں
ابھی تو دور تک پتھر پڑے ہیں
ابھی تو دور تک خنجر گڑے ہیں
مگر اب بھی ہیں تیری راہ تکتے
مری پتھرائی آنکھوں کے جھروکے
کبھی تو آئیں گے مجھ کو منانے
دلِ ویران کا گلشن کھلانے
کبھی تو ختم ہو گی یہ اذیت
یہ لمبی انتظارِ یار کی رت.....!

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گھٹتے گھٹتے میں کتاب عشق میں
ایک سطر انتسابی ہو گیا

خود فراموشی

ضروری نہیں
جنھیں ہم زندگی سے زیادہ اہم سمجھتے ہوں
ان کے لئے بھی ہم اتنے ہی اہم ہوں
کبھی کبھی ہم ساتھ تو ہوتے ہیں
لیکن محسوس نہیں ہوتے
وقت کے پلوں کے نیچے سے پانی گزر جاتا ہے
خامشی روح میں گھر کر لیتی ہے
زیست تنہا پسند ہو جاتی ہے
ہم خود کو اتنا اکیلا کر لیتے ہیں
کہ ہمیں خود کی بھی ضرورت نہیں رہتی
اپنی ذات سے لاتعلقی
بھی کبھی کبھی نعمت لگتی ہے
درد ہوتے ہوئے بھی محسوس نہیں ہوتا
ہجر و فراق کے موسم طبیعت پر گراں نہیں گزرتے
جذبوں پر بے حسی کی دھندیوں چھا جاتی ہے
کہ احساسات سے وابستہ ہر منظر دھندلا لگتا ہے
ہم اپنی تنہائی کا ہاتھ تھامے
اپنے آج سے گریزاں
گزشتہ زمانوں کے سحر میں گم جیئے جاتے ہیں
وقت ہم پر ہنستا ہے
زندگی ہمیں گزار دیتی ہے

نائلہ راٹھور

خدا مجھ کو بلاتا ہے

خدا مجھ کو بلاتا ہے
وہ کہتا ہے کہ نفسِ مطمئنہ لے کے آجاؤ
مرے بندوں کی صف میں
اور پھر جنت تمہاری ہے
میں کہتا ہوں کہ آخر نفس کیسے مطمئن ہوگا؟
مجھے چاروں طرف سے خواہشوں نے
گھیر رکھا ہے
مرے ہر اک نفس میں بے کراں نفرت
کے ڈیرے ہیں
عداوت کے اندھیرے ہیں
میں رہ گم کردہ ہوں طول امل کے خواب
کے پیچھے
خلاؤں میں معلق دور کے مہتاب کے پیچھے
کسی گرداب کے پیچھے
کہ دورانِ عبادت ذہن و دل حاضر نہیں ہوتے
مرے وہم و گماں میں خواہشوں کا دور
ہوتا ہے
مرے پیشِ نظر سجدوں میں کوئی اور ہوتا ہے
سکوں حاصل نہیں ہوتا
میں رب العالمیں سے مانگ کر کچھ
عارضی چیزیں
فٹافٹ لوٹ آتا ہوں
بنا داخل ہوئے بندوں کی صف میں اور جنت میں
نہ راضی ہو کے جاتا ہوں
نہ راضی کر کے آتا ہوں
مگر میرا خدا اک بار مجھ کو پھر بلاتا ہے
وہ پھر کہتا ہے نفسِ مطمئنہ لے کے آجاؤ
میں اس سے پوچھتا ہوں نفس کیسے
مطمئن ہوگا
جواب آتا ہے کہ میری رضا میں راضی
ہونے سے
رضا میں راضی ہونے سے؟
میں جونہی بڑبڑاتا ہوں
تو اِک آواز آتی ہے
خداوندا ترے بندے تری مرضی پہ راضی ہیں
خدا آواز دیتا ہے کہ میں بھی تم سے راضی ہوں
سو اب اٹھو، جیو اور میری جنت میں چلے آؤ
کہ تم وہ ہو جو نفسِ مطمئنہ لے کے آئے تھے
میں اپنے نفس کی گٹھڑی اٹھاتا ہوں
اور اپنے دارِ بے تابی میں پھر سے لوٹ آتا ہوں
خدا مجھ کو بلاتا ہے

علمدار حسین

کردار کی واپسی

وہ
کہانی میں موجود
کیوں نہیں
کہاں پر ہے؟
کہیں بھی نہیں
دیکھنے والے
اُسے منظر کی خوبصورتی میں
لفظوں کے دروبست میں
ڈھونڈ رہے ہیں
وہ سامنے دکھائی دیتا ہے
باتیں کرتا ہے
آنسو بہانے، مسکرانے
بلکہ
قہقہہ لگانے کی صلاحیت رکھتا ہے
لیکن رُکا ہوا
ٹھہرا
جیسے برف
جس کے پگھلنے کا نام ونشاں تک نہیں
تفہیم سے ماورا
جیسے اُس کا ہونا، نہ ہونا برابر ہے

وہ حیرانی' پریشانی میں
کبھی آسمانی ستاروں سے پوچھتا ہے
کبھی بادلوں سے سوال کرتا ہے
اُس نے کبھی چاند کی طرف نہیں دیکھا
سورج نے ہمیشہ اُسے ننگی گالیاں دیں
اُسے بارش کی کن من پہ اعتماد ہے
کہ وہ نمو پزیری کی تعبیر سے ہم کنار ہے
اسے خدا پر یقین ہے
کہ وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے

امجد بابر

زندگی

زندگی، راز روشن نہیں
راز سربستہ ہے
زندگی، دار درد و الم
دار جاہ و حشم
دار رنج و محن، دار علم و عمل
زندگی گیت ہے
کوئی سنگیت ہے
زندگی جیت ہے
زندگی ہار ہے
زندگی نظم ہے
زندگی ہے غزل
زندگی دشت ہے
زندگی ہے محل
زندگی بوجھ ہے، زندگی بار ہے
زندگی پھول ہے، زندگی خار ہے
زندگی پیار ہے
زندگی ہجر بھی، زندگی وصل بھی
زندگی کا نہ جانے کوئی اصل بھی
زندگی، کب سے ہے
کچھ خبر ہی نہیں
زندگی، کب تلک ہے
پتا ہی نہیں
زندگی کا بھلا
کیا ازل، کیا ابد
زندگی، یوں ہی جاری ہے، جاری رہے گی
مگر، یہ زمیں زاد
بستے، اُجڑتے رہیں گے
مناظر وہی اور
اماکن وہی
روز و شب بھی وہی
عشق کے بھی وہی رت جگے
حسن کے بھی وہی سلسلے
دل کی قسمت مگر ہے وہی بے کلی
تا قیامت چلے گی یوں یہ زندگی

شوکت محمود شوکت

اُس پار

جہاں تصویر بنواتے ہوئے
جو مسکراہٹ ہے
وہی چہرے پہ سچ مچ ہو
جہاں یہ سرمئی شامیں
پہاڑوں سے الجھتی ہوں
جہاں یہ چاندنی
شبنم کے سائے میں ٹہلتی ہو
جہاں امید کی سب کشتیاں
دل کے سمندر میں اترتی ہوں
جہاں آنکھوں کے خوابوں کو
حسیں تعبیر ملتی ہو
جہاں خاموشیوں نے آسماں کے راز کھولے ہوں

جہاں ان موسموں پہ دھوپ کا پہرا نہیں ہوتا
جہاں سینے میں کوئی درد اُٹھتا ہو
مگر گہرا نہ ہو پائے
جہاں ایقان کے پنچھی اڑیں۔۔۔!
اُن کو کوئی خطرہ نہ لاحق ہو
جہاں اِس جسم کی سرحد نہ ہو کوئی
حیات اور موت کو جس جا
کوئی الجھن نہ گھیرے ہو۔۔۔!
مجھے بھی لے چلو
اس پار۔۔۔!

زعیم رشید

خوف

چوپٹ نگری
اندھا راجہ
ظلمت ہی بس
ظلمت ہے
خوف کے سائے
منڈلاتے ہیں
لہو لہو ہے
نگری ساری
کرچی کرچی
سپنے سارے
گم سم گم سم
سارا عالم
سہمے سہمے
سارے لوگ
جنگل سی اس
دنیا میں اب
جنگل راج ہی
باقی ہے
گر جینا دشوار ہے
طاہر
دنیا کے اس
برزخ میں
آخر ہم
انسان جو ٹھہرے
جینا پھر بھی بنتا ہے
جینا پھر بھی بنتا ہے
جینا پھر بھی بنتا ہے

سید طاہر شیرازی

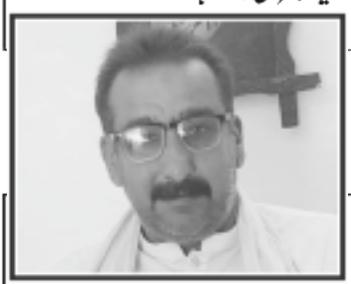

بے حسی

نفسا نفسی کا عالم ہے
اپنی ذات کی
جنگ ہے ساری
طاقت کی بس
جنگ ہے جاری
رشتوں کا کچھ
مول نہیں ہے
دھن دولت کا
کھیل یہاں ہے
لاشوں کے انبار
یہاں ہیں
کون سنے گا
بات کسی کی
مشکل کے اس دور
میں طاہر
زندہ رہنا مشکل ہے
زندہ رہنا مشکل ہے
زندہ رہنا مشکل ہے

دعا

اے مرے ربّ جلیل!
لکھنے بیٹھوں میں اگر حمد و ثنا
یوں قلم کانپتا ہے کہ میں ڈر جاتا ہوں
جانتا ہوں
سب سمندروں کی سیاہی بھی میسّر ہو اگر
اَور شجر سارے بھی قلم ہو جائیں
پھر بھی تعریف مکمل ہو تیری؟
میرے ربّ! یہ تو ممکن ہی نہیں!
اے میرے ربّ جلیل! اے میرے
مالکِ ارض و سما!
مجھ پہ اتنا سا کرم تُو کر دے
اِک عطا تو نے کیے ہم کو نبیؐ
وہ ترے رحمت العالمین
جو ہمیں دے کے گئے ہیں سبھی دَرس ترے
ترے ایماں کے، محبت کے، یقیں کامل کے
کہ ہے تو ہی فقط لائق سجدوں کے
بَس، کرم اِتنا سا ہم پر کر دے
اُن کی برکات ہمیں یاد رہے
اور اُن پر ہو عمل بھی اپنا
تا کہ جب حشر کے روز
لے کے سب نامۂ اعمال اپنا
ہم ترے سامنے حاضر ہوں گے
ترے وہ پیارے نبیؐ، اپنے وہ پیارے نبیؐ
وہ ترے پاس کھڑے تو ہوں گے
تو پھر اُس وقت مرے ربّ جلیل
اپنی آنکھیں نہ جھکیں
ہم نہ شرمندہ ہوں ترے آگے، تیرے
نبیؐ کے آگے
بس یہی ایک دعا ہے اپنی
اے مرے رَبّ جلیل
میرے ربِّ کریم، اے مرے رَبّ رحیم

محمد یوسف

صبح کی پہلی کرن

صبح کی پہلی کرن.....

شام اتری آسماں کی سیڑھیوں سے تو

تری یاد آئی ہے

صبح کی پہلی کرن .....

دیکھ میری ذات کے تاریک بن میں کس

قدر تنہائی ہے

صبح کی پہلی کرن.....

باغِ نادیدہ سے یوں گم ناميوں کے

پھول چننا چھوڑ دے

گیلی گیلی سبزسی اس گھاس پر

یوں ٹہلنا چھوڑ دے

رات کا در توڑ دے

صبح کی پہلی کرن.....

جلدی جلدی آسماں کی سیڑھیاں نیچے اتر

اور میری ذات کے تاریک بن کی سیر کر

ڈھونڈ اس میں شادمانی کا ہرن

صبح کی پہلی کرن.....

مہر علی

ہجر

دلشاد احمد

ہجر توں کے موسم میں
چاہتوں کی اَن بَن میں
یاد کے دریچوں سے
اک ترے تصور کا
واہمہ سا ہوتا ہے
اور اِسی تصور میں
خواب ٹُوٹ جاتا ہے
خواب کے بکھرنے سے
خوش گمان لمحوں کا
مان ٹُوٹ جاتا ہے
اس بھرم کے رکھنے کو
زندگی کی پلکوں پر
آنسوؤں کی برکھا جب
گیت گنگنائے تو
صبح ہو ہی جاتی ہے
رات کٹ ہی جاتی ہے.....!

پرچھائی

دستِ راست میں موقلم تھامے
وہ کینوس پر رنگوں کا جادو بکھیرنے میں
مصروف تھی
زلفیں کوتاہ تھیں
انہیں پیشانی کے سامنے سے ہٹانے کی
ضرورت اسے محسوس نہیں ہوئی۔
لال، پیلے، اور ہرے رنگوں کی آمیزش سے
تصویر کے خدوخال بڑی نفاست سے
ابھر رہے تھے
میں نے خود کو اس کے قریب جانے سے
روکے رکھا،
کہیں یہ دخل اندازی اُس کی خلوت پر
گراں نہ گزرے۔
تصویر کے نقش یکے بعد دیگرے
سامنے آتے جا رہے تھے

تیکھی ناک، لب لعل، گلابی رخسار،
دراز زلفیں، اونچا قد اور غزال جیسی آنکھیں!
نہ جانے اُس کے دل کو اتنا حسین چہرہ
تراشنے کی
ضرورت کیوں پیش آئی۔
میں سوچنے لگا!!!
شاید اُس کے اپنے وجود کی خوبصورتی
کینوس پر اظہار کا تقاضا کر رہی تھی
جب تصویر مکمل ہوئی، تو میں
اُسے قریب سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا
لیکن تصویر پر اُس کی سیاہ پرچھائی
نظروں کے سامنے آتے ہی
میرا قدم بے اختیار پیچھے ہٹ گیا

شبیر احمد آکاش

نظم

محبت رمز ہے گہری
کبھی یہ فقر لگتی ہے
صدائے کن کی چاہت میں
سفر میلوں یہ کرتی ہے
کبھی گلزار بن جائے
کبھی یہ نوح کی کشتی
کبھی گمنام ہو جائے
کبھی ہر رنگ کو پکڑے
محبت موم جیسی ہے
یہ حدت سے پگھلتی ہے
کبھی محفل میں سجتی ہے
کبھی صحرا بھٹکتی ہے
کبھی بس ایک خواہش میں
یہ خود پہ جبر کرتی ہے
محبت سات رنگوں کی
کوئی تشہیر ہو جیسے
محبت راگ ہو جیسے
محبت وصل کی خواہش
محبت دل نشیں تعبیر جیسی ہے
محبت صبر سے
لپٹی ہوئی زنجیر ہو جیسے
ستاروں سے جڑی
امید کی تصویر ہو جیسے
محبت جاری و ساری
بقا کی ریت ہو جیسے

محبت وجد ہو جیسے
کہ ہر لحظہ ٹھٹکتی ہے
محبت فرض ہو جیسے
کہ ہر دل پہ اترتی ہے
محبت درد ہو جیسے
کہ سینوں میں تڑپتی ہے
محبت سانس ہے بھرتی
محبت رقص کرتی ہے
محبت اپنے جیسوں کی
نئی اک طرز کرتی ہے

شائستہ رمضان

آخری قدم پر آخری خود کلامی

اعجاز رضوی

اک قدم پر ہی زمیں ختم ہوئی
کچھ قدم اور اُٹھانے تھے مجھے
اک قدم میرے بھروسے کا قدم
اک قدم میری خواہشوں کا قدم
اک قدم میری تمناؤں کا
اک قدم میری عمل داری کا
اک قدم میری علم داری کا
اک قدم آنکھ کے اشارے کا
اک قدم دھوم بڑھے قدموں کی
اک قدم بیعت میرے ہاتھوں پر
اک قدم سر ہوں میرے قدموں پر
اک قدم پر ہی زمیں ختم ہوئی
کچھ قدم اور اُٹھانے تھے مجھے

آخری بس کا انتظار
نیلما ناہید درانی

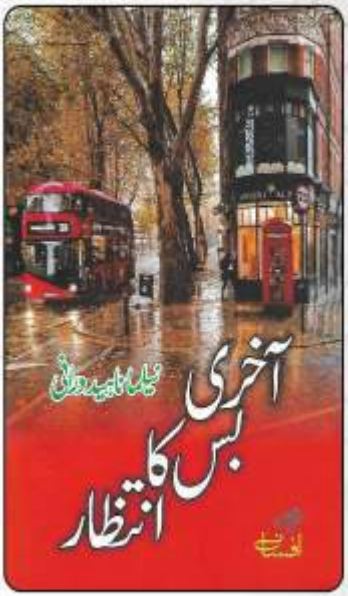

پورا چاند اور تنہا رات
نیلما ناہید درانی

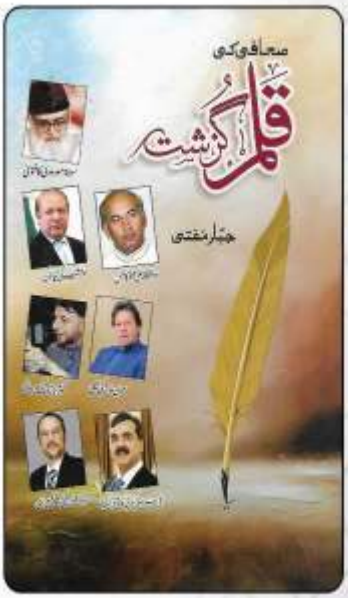

صحافی کی
قلم گزشت
جبار مفتی

نیل کھیت
(ناول)

جناب مظہر حسین اختر، جناب خالد احمد، جناب اشرف جاوید، جناب امیر حسین جعفری، جناب عباس تابش، جناب نجیب احمد
جناب اے جی جوش، محترمہ فرحت پروین، جناب احمد ندیم قاسمی، محترمہ منصورہ احمد، جناب اشفاق احمد

جناب شوکت علی شاہ، جناب خالد احمد، جناب انور سجاد

جناب ارشد شاہین، جناب ارشد چوہدری، جناب خالد احمد، جناب عطاالحق قاسمی،
جناب نجیب احمد، جناب محمد رفیق غوری، جناب عزیر احمد